Regd. L. No. 7243

Phone. 00

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جنوری 1973

اس پرچہ میں

(۱) پرویز صاحب کا خطاب

"ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ"

(۲) مودودی صاحب کی تفسیر پر تبصرہ

آئندہ پرچہ میں

پرویز صاحب کا خطاب

"کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟"

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر!

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدلِ اشتراک	تعدادِ اشاعت	قیمت فی پرچہ
پاکستان سالانہ ـــــــ دس روپے غیر ممالک سالانہ ـــــــ ایک پونڈ	۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی۔ گلبرگ ۲ لاہور	ایک روپیہ
جلد (۲۶)	جنوری ۱۹۷۳ء	نمبر (۱)

فہرست

۱- لمعات .... (۲)

۲- شرمناک پروپیگنڈہ .... (محترم محمد اسلام صاحب) ... (۷)

۳- روئیداد طلوعِ اسلام کنونشن .... (محترم غلام صابر صاحب) .. (۱۵)

۴- ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ .... (محترم پرویز صاحب) .... (۲۵)

۵- تفہیم القرآن (جلد دوم۔ مولانا مودودی) پر ایک نظر۔ (شاہد عادل) ... (۴۹)

ایڈیٹر۔ محمد خلیل، ناشر سراج الحق، مقام اشاعت ۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور، پرنٹر شیخ محمد اشرف مطبوعہ ۔ اشرف پریس۔ ایبک روڈ لاہور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لمعات

متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

لاہور میں آج کل صبح کے وقت اس قدر دبیز دھند ہوتی ہے کہ اس میں کوئی شے صاف طور پر نظر نہیں آتی - یہ دھند نہ لاہور سے مخصوص ہے نہ صبح کے وقت تک محدود۔ ملک کی ساری فضا اس قدر کہر آلود ہو رہی ہے کہ اس میں کوئی مسئلہ صاف طور پر سامنے آتا ہی نہیں۔ ایک تشتتِ فکر و نظر ہے جو ہر ذہن کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے۔ ایک انتشارِ قلب و دماغ ہے جو جوہرِ فکر کو دھندلائے ہوئے ہے۔ یہ حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی جس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو ماؤف کر کے اسے جذبات کے سیلاب میں دھکیل دیا جائے۔ جب ۱۹۶۸-۶۹ء میں قوم کو اس سیلاب کی طرف ہنکایا جا رہا تھا تو ہم نے اُسی زمانے میں وارننگ دی تھی کہ جذبات پرستی کی اس شراب میں بدمستیوں کی لذت ضرور ہے لیکن اس کا خمار بڑا استخواں شکن ہوگا، اور قانون شکنی اور ہنگامہ خیزی کی جس تلوار کو آپ آج فریقِ مقابل کے خلاف استعمال کر رہے ہیں، کل کو یہی پلٹ کر آپ کے سینے میں پیوست ہو جائے گی۔ قرآن کریم کے الفاظ میں، وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ "بُری تدبیر کوئی بھی کرے آخر الامر وہ خود اسی کی لپیٹ میں آجایا کرتا ہے۔" اور اس کے بعد اس نے قانونِ مکافاتِ عمل کا ایک غیر متبدل اصول بتایا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یہ لوگ جو اس وقت اس قسم کی تدابیر کر رہے ہیں فَهَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ۔ اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ انتظار کر رہے ہیں کہ جو انجام اُن کا ہوا تھا جن کے خلاف انہوں نے اس قسم کی تدابیر اختیار کی تھیں، وہی انجام ان کا بھی ہو — اور ایسا ہو کر رہے گا، اسلئے کہ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيلًا۔ (۳۵/۴۳)، تم خدا کے قانونِ مکافات میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ تبدیلی تو ایک طرف تم یہ بھی نہیں دیکھو گے کہ اس نے اپنا رُخ ہی بدل لیا ہو۔ اصلاحِ احوال و کوائف کی صحیح صورت یہ ہے کہ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (۱۱/۱۱۴)۔ تخریبی امور کے مٹانے کا طریق یہ ہے کہ ان سے زیادہ وزنی تعمیری کام کئے جائیں۔ تخریب کا مداوا صرف تعمیر کر سکتی ہے۔ صحیح مصلحین (ریفارمرز) وہی ہیں جن کا شیوہ یہ ہے کہ يَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ۔ وہ خرابیوں کی روک تھام بھلائیوں سے کرتے ہیں۔ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ۔ (۱۳/۲۲) سانجامِ کار خوشگواریاں اور کامرانیاں انہی کے حصے میں آتی ہیں۔ یہ ہے خدا کا اٹل قانون اس کی خلاف ورزی کرنے والے جو جی میں آئے کر کے دیکھ لیں، نتیجہ اس کا تباہی

اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا لیکن مصیبت یہ ہے کہ اس قسم کی غلط روش کے نتیجہ میں جو تباہی آتی ہے وہ انہی لوگوں تک محدود نہیں رہتی جو اس غلط روش کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ وہ ساری کی ساری قوم کو اپنی لپیٹ میں لیا کرتی ہے۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً ۚ (۸/۲۵) اس تباہی سے بچنے کا سامان کر لو جو جب آتی ہے تو ظالمین تک ہی محدود نہیں رہا کرتی۔ وہ سیلاب بلا پورے کے پورے معاشرہ کو بہا کر لے جایا کرتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ "بحالاتِ موجودہ" اس تباہی سے بچنے کی صورت کیا ہے؟ ہم نے "بحالاتِ موجودہ" کی تخصیص اس لئے کی ہے کہ قوم نے اپنے لئے جو سیاسی روش اختیار کر رکھی ہے یہ خرابیاں اسی کی پیدا کردہ ہیں۔ اور اسی میں اصلاح سے ان خرابیوں کے علاج کی صورت تلاش کرنی ہوگی ——— ورنہ حقیقی اصلاح تو صرف اس وقت ممکن ہوگی جب قوم میں فکری تبدیلی پیدا ہوگی۔ قوم نے اپنے لئے "مغربی جمہوریت" کو بطور سیاسی روش اختیار کر رکھا ہے۔ لیکن جمہوریت کا لفظ صرف زبانوں پر ہے دل سے یہاں کوئی بھی جمہوریت کا خواہاں نہیں۔ جمہوریت کے معنی بتائے جاتے ہیں قوم کی مرضی کے مطابق حکومت قائم کرنا۔ قوم کی مرضی معلوم کرنے کا طریق "الیکشن" تجویز کیا جاتا ہے۔ الیکشن میں جو پارٹی اکثریت حاصل کر لیتی ہے اس کے متعلق سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ قوم کی مرضی کی نمائندگی کرتی ہے۔ جو پارٹیاں اقلیت میں رہ جاتی ہیں اگر وہ بہ دل جمہوریت کی قائل ہیں تو انہیں اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ اگلے الیکشنوں تک قوم کی مرضی کی نمائندگی اکثریت کی پارٹی کرتی ہے' اقلیت کی پارٹیاں نہیں۔ لیکن ہمارے ہاں ہوتا یہ ہے کہ ادھر اکثریت کی پارٹی حکومت قائم کرتی ہے' ادھر اقلیتی پارٹی یا پارٹیاں اس کے خلاف محاذ قائم کر لیتی ہیں اور ہر ممکن کوشش کرتی ہیں یہ ثابت کرنے کے لئے کہ قوم کی مرضی کی نمائندگی اکثریتی پارٹی نہیں کرتی ہم کرتی ہیں۔ مقصد ان کا یہ ہوتا ہے کہ اگلے الیکشن سے پہلے ہی برسرِ اقتدار پارٹی کی حکومت کا خاتمہ کر کے خود مسندِ اقتدار پر قابض ہو جائیں۔ آپ غور کیجیے کہ ان پارٹیوں کی یہ روش خود اس اصولِ جمہوریت کے کس قدر خلاف ہے جسے یہ زبان سے دن رات دہراتی رہتی ہیں۔ نتیجہ اس کا مسلسل خلفشار کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ جن قوموں نے نظامِ جمہوریت کو بہ دل تسلیم کیا ہوتا ہے' ان میں اقلیتی پارٹیاں' اکثریتی پارٹی کی حکومت کے غلط اقدامات پر تنقید تو کرتی رہتی ہیں لیکن اپنے آپ کو قوم کی مرضی کی نمائندہ کی حیثیت سے پیش یا مسلط نہیں کرتیں۔ اس مقصد کے لئے وہ آئندہ الیکشن تک کا انتظار کرتی ہیں۔

اب آئیے اکثریتی پارٹی کی طرف۔ وہ الیکشن میں چند نشستیں زائد حاصل کر لینے کے بعد سمجھ لیتی ہے کہ ہم سیاہ کریں یا سفید (کم از کم) آئندہ الیکشن تک حکومت کرنا ہمارا مسلّمہ حق ہے اور قوم ہمارے اس حق کو ہم سے چھین نہیں سکتی۔ اس ذہنیت کے ماتحت وہ اپنی حیثیت قوم کی مرضی کی نمائندہ نہیں سمجھتی' اپنے آپ کو بہرحال قوم پر مسلط رکھنے کی حقدار سمجھتی ہے۔ اس سے جمہوریت' جہانگیریت میں بدل جاتی ہے اور برسرِ اقتدار طبقہ قوم سے اوّلاً بزبانِ حال (اور بعدہٗ بزبانِ قال) کہہ دیتا ہے کہ تم جو جی میں آئے کر لو' ہم (کم از کم آئندہ الیکشن تک) تمہارے سر پر مسلط رہیں گے۔ اگر تم ہماری بات بطیبِ خاطر نہ مانو گے تو ہم اسے ڈنڈے کے زور سے منوائیں گے۔ اس کا نام وہ رکھتے ہیں' قانون کے زور پر حکومت کا قیام (ESTABLISHED BY LAW)

اور عملاً مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ تم ہمیں ووٹ دے کر جو حماقت کر بیٹھے ہو، اس کا اب خمیازہ بھگتو. نتیجہ اس کا فساد اور خلفشار کے سوا کچھ نہیں ہوتا. یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اکثریتی پارٹی یہ کس طرح معلوم کرے کہ اس کے اقدامات کو قوم کی رضامندی حاصل ہے یا نہیں؟ اگر یہ کہا جائے کہ اس کے جس فیصلہ کے خلاف قوم احتجاج کرے، اس کے متعلق سمجھ لیا جائے کہ وہ قوم کی مرضی کے خلاف ہے تو اس میں خطرہ یہ ہے (اور یہ خطرہ آئے دن ہمارے سامنے عملاً نمودار ہوتا رہتا ہے) کہ اقلیتی پارٹیاں جب جی چاہے قوم کو مشتعل کر کے، حکومت کے خلاف احتجاج پر آمادہ کر دیں گی. یہ ہے مغربی نظامِ جمہوریت کا بنیادی نقص جو تمام خرابیوں کا ذمہ دار ہے. جو قومیں اصولِ جمہوریت کو دل سے تسلیم کرتی ہیں، ان کے ہاں ایسی صورت شاذ و نادر پیدا ہوتی ہے. ان کی اکثریتی پارٹی اپنی انگلیاں قوم کی نبض پر رکھتی ہیں اور جونہی محسوس کرتی ہے کہ ان کے کسی فیصلہ کا نتیجہ قوم کے مفاد کے خلاف جا رہا ہے، وہ اسے خود ہی واپس لے لیتی ہے اور اگر دیکھے کہ ملک کا سنبھالنا ان کے بس کی بات نہیں رہا تو مستعفی ہو جاتی ہے. پوری پارٹی کا مستعفی ہو جانا تو ایک طرف، پارٹی کے افراد کی بھی یہ حالت ہوتی ہے کہ ان میں سے جونہی کوئی دیکھے کہ اس کا کوئی قدم ملک کے مفاد کے خلاف اٹھ گیا ہے، وہ اپنا استعفیٰ پیش کر دیتا ہے. آپ کو یاد ہوگا کہ چند سال ادھر جب حکومتِ انگلستان کا فنانس منسٹر بجٹ پیش کرنے کے لئے ایوانِ حکومت میں جا رہا تھا تو اسے ڈیوڑھی میں معلوم ہوا کہ بجٹ کا ایک اہم راز افشا ہو گیا ہے. اندر جا کر اس نے بجٹ پیش کرنے کے بجائے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا. لیکن ہمارے ہاں اس ذہنیت تک پہنچنے کے لئے تو معلوم ابھی کتنی مدت درکار ہوگی. یہاں تو ہر شخص کو کرسی حاصل کرنے کی ہوس اور حاصل کر لینے کے بعد اس کے ساتھ چپکے رہنے کی کوشش، اصول و اقدار کی طرف سے اندھا کر دیتی ہے. ان حالات میں ہمارے ہاں اس مشکل کا حل اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا کہ آئینِ پاکستان میں کوئی ایسا طریق تجویز کیا جائے جس کی رو سے قوم برسرِ اقتدار پارٹی کو آئندہ الیکشن سے قبل حکومت سے الگ کر سکے. ہمارے آئین میں (جو اس سے پہلے منصۂ شہود پر آتے رہے ہیں) کسی پارٹی کو اقتدار تفویض کرنے کے لئے تو بڑی تفصیلی شقیں رکھی جاتی ہیں لیکن عند الضرورت، اسے اقتدار سے الگ کرنے کے لئے کوئی مؤثر طریق تجویز نہیں کیا جاتا. سربراہِ مملکت کو اقتدار سے الگ کرنے کے لئے جو طریق کار تجویز کیا جاتا ہے وہ "نو من تیل اکٹھا کر کے رادھا نچوانے" کے مرادف ہوتا ہے. طریق سہل الحصول اور ممکن العمل ہونا چاہیئے. اور ایسا کہ جس کی رو سے برسرِ اقتدار طبقہ کے حکومت سے علیحدگی کے ساتھ، حکومت قائم رکھنے کا مؤثر طریق بھی موجود ہو. اگر ایسا نہ ہو تو ملک میں فوضویت (انارکی) پھیل جائے گی. ہمارے ہاں جس قدر خلفشار پیدا ہوتے ہیں، وہ آئین میں اس قسم کے مؤثر طریق کار کی عدم موجودگی کا نتیجہ ہیں. ہم سمجھتے ہیں کہ اس وقت اقلیتی پارٹیوں کو چاہیئے کہ وہ انتشار کے ذریعے تبدیلی پیدا کرنے کے بجائے سر جوڑ کر بیٹھیں اور زیرِ تسوید آئین میں اس قسم کی شق رکھنے کے مسئلہ پر غور کریں. اکثریتی پارٹی کو بھی اس قسم کی تجویز کی مخالفت نہیں کرنی چاہیئے. اس لئے کہ آئین میں ایسے طریق کار کا اطلاق ہر حکمران پارٹی پر ہوگا، خواہ وہ موجود ہو اور خواہ آنے والی. یہی وہ طریق کار ہوگا جس سے برسرِ اقتدار طبقہ فی الواقعہ قوم کی مرضی کے مطابق حکومت قائم رکھنے کی کوشش کریگا اور اقلیتی جماعتوں کو انتشار پیدا کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی. اور اگر کوئی جماعت، اس طریق کار کو نظر انداز کر کے خلفشار پیدا کرنے

کی کوشش کریگی تو قوم اس کی مخالفت کریگی۔ اقلیتی جماعتوں کے علاوہ ملک کے ارباب دانش و بینش کو بھی چاہیئے کہ اس قسم کے طریق کار کے لئے اپنی تجاویز قوم کے سامنے لائیں اور اخبارات میں ان پر بحث و تمحیص ہو۔ یہ طریق کار ملک میں امن قائم کرنے کا مؤثر ذریعہ بھی ہوسکتا ہے اور یہ معلوم کرنے کا مقیاس بھی کہ کون سے عناصر ملکی اور قومی مفاد کے لئے حکومت میں تبدیلی کے خواہاں ہیں اور کون سے محض تخریب کے درپئے ہیں۔ صدر بھٹو کے وعدہ کے مطابق پاکستان کا مستقل آئین' مارچ ۷۳ء میں نافذ ہوجانا چاہیئے۔ اگر اس آئین میں یہ شق مؤثر طور پر شامل ہوجائے تو قوم سکھ کا سانس لے سکیگی ورنہ اس وقت ملک جس تذبذب اور اضطراب کے منجدھار میں پھنسے ہوا ہے اس کے انجام کے تصور سے رُوح کانپ اٹھتی ہے۔ خدا اس خطۂ زمین کو اپنی حفاظت میں رکھے۔

جہاں تک موجودہ کشاکش کا تعلق ہے' یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس میں نمایاں طور پر) متخالف فریق پیپلز پارٹی اور جماعت اسلامی ہیں۔ پیپلز پارٹی کی برسرِ اقتدار حکومت کی کارکردگی قوم کے سامنے ہے مگر آئینِ پاکستان میں مذکورہ بالا شق رکھ دی گئی تو قوم خود اس کا فیصلہ کرلے گی کہ وہ اس حکومت کو برقرار رکھنا چاہتی ہے یا نہیں۔ جہاں تک دوسرے فریق (جماعت اسلامی) کا تعلق ہے' اسے آج تک اقتدار حاصل کرنے کا موقعہ نہیں ملا اس لئے قوم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتی کہ اگر اقتدار ان کے ہاتھ میں چلا گیا تو یہ کیا کرے گی۔ البتہ اس جماعت کے جو عزائم اور مقاصد سامنے آچکے ہیں' ان کی روشنی میں اس امر کا اندازہ لگانے میں چنداں دشواری نہیں ہوسکتی۔ طلوع اسلام ان کے عزائم اور مقاصد کے متعلق گذشتہ پچیس سال (بلکہ یوں کہیئے کہ گذشتہ تیس سال) سے لکھتا چلا آرہا ہے۔ ان کی تفصیل طول طویل ہے جس کی اس وقت گنجائش نہیں۔ ہم ان میں سے صرف دو تین اصولی باتوں کے دہرانے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ مودودی صاحب کے نزدیک زندگی کی عملی ضروریات کے لئے جھوٹ بولنے کی نہ صرف اجازت ہوتی ہے۔ بلکہ ایسا کرنا واجب ہوجاتا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

> راستبازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔
>
> (ترجمان القرآن ۔ بابت مئی ۵۸ء)

ان کی قائم کردہ حکومت کس انداز کی ہوگی' اس کے متعلق مودودی صاحب کا ارشاد ہے۔

> اس نوعیت کا اسٹیٹ ظاہر ہے کہ اپنے دائرہ عمل کو محدود نہیں کرسکتا۔ یہ ہمہ گیر اور کلی اسٹیٹ ہے اس کا دائرہ عمل پوری انسانی زندگی کو محیط ہے۔ یہ تمدن کے ہر شعبہ کو اپنے مخصوص اخلاقی نظریہ اور اصلاحی پروگرام کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں کوئی شخص اپنے کسی معاملہ کو پرائیویٹ اور شخصی (PERSONAL) نہیں کہہ سکتا۔ اس لحاظ سے یہ اسٹیٹ فاشستی اور اشتراکی حکومتوں سے ایک گونہ مماثلت رکھتا ہے۔ (اسلام کا نظریہ سیاسی)

جو لوگ اپنی زندگی کو ان کے تجویز کردہ قالب میں ڈھالنے پر رضامند نہ ہوں گے' ان کا حشر کیا ہوگا' اس کے متعلق مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

> میرے نزدیک اس کا حل یہ ہے (واللہ الموافق للصواب) کہ جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رونما ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظامِ اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانینِ اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجباتِ دینی پر انہیں مجبور کیا جائے گا اور پھر جو کوئی دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ (مرتد کی سزا، ص ۸ ـ جون ۱۹۵۳ء ایڈیشن)

یہ تصریحات بالکل واضح اور غیر مبہم ہیں۔ ان کی روشنی میں، قوم خود فیصلہ کرے کہ وہ اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں دے کر اپنی اجتماعی ہلاکت کے لئے تیار ہے؟

جہاں تک سیاسی مطلع کی گرد آلودگی کا تعلق ہے، اس کے صاف ہونے کی اس کے سوا کوئی شکل نہیں کہ قوم کا ذہن صاف ہو۔ قوم کے ذہن کے صاف ہونے سے مراد یہ ہے کہ زندگی کے اہم معاملات کے سلسلہ میں جو الفاظ ہم روز بولتے ہیں اور جو اصطلاحات ہم استعمال کرتے ہیں، ان کا مفہوم اس طرح غیر مبہم اور متعین ہو کہ قوم کا ہر فرد ان کا یکساں مطلب سمجھے اور ایک ہی مفہوم لے۔ جہاں تک دینی تصورات اور قرآنی اصطلاحات کا تعلق ہے، پرویز صاحب نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف لغات القرآن میں اس مقصد کو پورا کر دیا۔ جن احباب نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ لغات' قرآنی الفاظ کے معانی ہی بیان نہیں کرتی' وہ دین کے بنیادی اصول و اقدار کی وضاحت کرتی ہے اور قرآن کے تصورات اور اصطلاحات کا مفہوم متعین کرتی ہے۔ اس سے قرآن کریم کے مطالب نہایت وضاحت سے سامنے آجاتے ہیں اور دین کے بنیادی تصورات نکھر جاتے ہیں۔ اس دفعہ طلوعِ اسلام کے کنونشن کے ایک خطاب میں انہوں نے اسی قسم کی ایک اور کوشش کی، اور مذہب اور سیاست (یعنی دین) کے بعض اہم تصورات کا مروجہ (غلط) اور صحیح مفہوم سامنے لا کر واضح کیا کہ ہم کہاں کہاں غلطی کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ کیا ہے۔ ان کا یہ اہم خطاب جو ہمارے نزدیک اس راہ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے اشاعتِ حاضرہ میں قارئین کے پیشِ خدمت کیا جا رہا ہے۔ آئندہ اشاعت میں' ان کا ایک اور خطاب پیش کیا جائے گا جس کا عنوان ہے ـــ کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے ـــ اس خطاب نے اسلام کے متعلق بنیادی غلط فہمیوں کو رفع کیا اور بدلائل و شواہد یہ ثابت کیا کہ اس تیرہ سو سال کے عرصہ میں اسلامی نظریاتِ حیات ہی آگے چلے ہیں اور انہی میں اس امر کی صلاحیت ہے کہ یہ ہر زمانہ کی امامت کریں۔ ابدی حقائق نہ کبھی فرسودہ ہوتے ہیں' نہ بیکار و معطل۔ وہ ہر دور کے انسانی کاروان کے لئے مشعلِ ہدایت بنتے ہیں۔

طلوع اسلام کنونشن کا خطاب

شرمناک پراپیگنڈہ

محترمہ محمدہ اسلام ۔ کراچی

صدرِ محترم و سامعین گرامی!

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، تحریکِ طلوع اسلام نہ مروجہ معنوں میں کوئی سیاسی تحریک ہے اور نہ ہی اس کا تعلق کسی مذہبی فرقے سے ہے اس کا مقصدِ وحید خالص قرآنی فکر کی نشر و اشاعت ہے اور منتہیٰ یہ ہے کہ اسلام میں جو غیر قرآنی تصورات شامل ہو گئے ہیں انہیں الگ کر کے پھر سے اس نظام کی تشکیل کے لئے فضا سازگار بنائی جائے جو عہدِ محمدؐ رسول اللہ والذین معہ میں قائم ہوا تھا۔ اس نظام کی تفاصیل تو طول طویل ہیں لیکن اختصار کی طرف آئیے تو اسے علامہ اقبالؒ کے ایک مصرعہ میں بیان کر دیا جا سکتا ہے کہ "موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کیلئے"

اب ظاہر ہے کہ جو تعلیم ہر نوعِ غلامی کے لئے پیغامِ موت ہو گی، مفاد پرست گروہوں کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہو گی۔ ان مفاد پرست گروہوں میں "ارباب اقتدار، سرمایہ پرست اور مذہبی پیشوائیت سب شامل ہیں۔ میں نے مذہبی پیشوائیت کو ارباب اقتدار اور سرمایہ دار طبقے سے محض سمجھانے کی غرض سے الگ رکھا ہے ورنہ اس گروہ (یعنی مذہبی پیشوائیت) میں پہلے دونوں گروہوں کی بنیادی خصوصیات از خود موجود ہوتی ہیں، بلکہ ان کی یہ خصوصیات ان گروہوں سے کہیں زیادہ نمایاں اور شدید ہوتی ہے۔ ارباب حکومت کا اقتدار لوگوں کے جسموں تک محدود ہوتا ہے لیکن مذہبی پیشوائیت کا اقتدار ان کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لئے ہوتا ہے سرمایہ دار طبقہ کچھ سرمایہ لگا کر دوسروں کی محنت کا استحصال کرتا ہے۔ لیکن مذہبی پیشوائیت ایک پیسہ انوسٹ (INVEST) نہیں کرتی اور دوسروں کی کمائی کا بیشتر حصہ محنت و مشقت کے بغیر غصب کر کے لے جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ گروہ کس طرح برداشت کر سکتا ہے کہ قرآنی فکر جو ان کے لئے موت کا پیغام ہے، عام ہو جائے۔ چنانچہ جب طلوع اسلام نے اس فکر کو بلند کیا تو مذہبی طبقہ نے اس خطرہ کو بھانپا اور ایک منظم سازش کے تحت اس کے خلاف پروپیگنڈہ کا محاذ قائم کر لیا۔ پروپیگنڈہ ویسے ہی مسلسل جھوٹ کا دوسرا نام ہے لیکن جب اس جھوٹ کو مذہبی تقدس کی سند حاصل ہو جائے تو اسے جہادِ عظیم کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں مودودی صاحب کا وہ فتویٰ مشہور ہے۔ جسے انہوں نے اپنے رسالہ ترجمان القرآن کی مئی ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں ان الفاظ میں شائع کیا تھا کہ۔

راست بازی و صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ

میں ایک بدترین برائی ہے لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب (یعنی واجب ہو جانے) تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔

اس فتویٰ کا نتیجہ تھا کہ کوئی جھوٹ نہ تھا جو تحریکِ طلوع اسلام کے خلاف نہ بولا گیا ہو اور کوئی ایسا اتہام نہ تھا جو اس کے بانی "پرویز صاحب" پر نہ لگایا گیا ہو ـــ یہ کہتا ہے کہ نمازیں تین ہیں اور روزے نو دن کے ہیں، نماز اردو میں پڑھنی چاہیئے، یہ منکرِ حدیث ہے، منکرِ سنت ہے، ایک نیا فرقہ ایجاد کرنا چاہتا ہے ـــ یہ اور نہ جانے اسی انداز کے اور کیسے کیسے جھوٹ ان کے خلاف تراشے گئے اور الزامات عاید کئے گئے۔ مجھے ان کی تردید میں کچھ نہیں کہنا کہ وقت نے خود کذب و افتراء کے اس طومار کی قلعی کھول دی ہے اور ملک کے سنجیدہ طبقہ پر حقیقت بے نقاب ہو چکی ہے لیکن اس وضاحت کے لئے کہ اس پروپیگنڈہ کی نوعیت کس قسم کی ہوتی ہے میں صرف ایک الزام کو بطور نمونہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے بھی جو جھوٹ اس الزام میں بولا گیا ہے ایسا ہے جس سے بدتر جھوٹ بولا نہیں جا سکتا۔ اور وہ نشتر ایسے زہرِ ہلاہل میں بجھا ہوا ہے جس کا تریاق کوئی نہیں ـــ کچھ عرصہ ہوا آغا شورش کاشمیری نے ایک کتابچہ شائع کیا جس کا نام ہے "فیضانِ اقبال"۔ اس کا مقدمہ (آستانۂ اقبال کے عنوان سے) ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے تحریر فرمایا ہیں نے اس کتابچہ کو دیکھا نہیں تھا کچھ دن ہوئے ایک صاحب نے کہا۔ اس کے مقدمہ میں دیکھئے سید عبداللہ صاحب نے پرویز صاحب کے متعلق کیا لکھا ہے، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ فیضانِ اقبال کے کے سلسلہ میں سید عبداللہ صاحب کے نوشتۂ تعارف کا پرویز صاحب سے کیا تعلق۔ وہ تعارف دیکھا تو میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس میں لکھا ہے۔

> لاہور میں یہ بھی طلوع ہوا ہے کہ ایک شخص جو شخصیتِ رسول کی اہمیت گھٹانے پر مامور ہے اور دین کو کچھ زوائد مسلمانوں کے سہل اور غیر ذمہ دار طرزِ زندگی کے مطابق ڈھالنے کے لئے ایک فرقے کی بنیاد رکھ چکا ہے۔ بدقسمتی سے اپنی مجلس کی رونق اشعارِ اقبال ہی سے بڑھا رہا ہے ظاہر ہے کہ جو شخص رسول ہی کو نہیں مانتا اور اپنے آپ کو قرآن کا عمرؓ اور ابوبکرؓ سے بہتر مفسّر سمجھتا ہے وہ اقبال کو کیا مانے گا، مگر رونق بڑھانے کے لئے اشعارِ اقبال کو یہ بھی گا تا ہے

آپ سوچئے عزیزانِ من! کہ جس شخص کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ رسول کو نہیں مانتا بلکہ شخصیتِ رسول کی اہمیت گھٹانے پر مامور ہے اور اپنے آپ کو حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ سے بھی بڑا مفسرِ قرآن سمجھتا ہے۔ وہ کونسا مسلمان ہے جس کی آنکھوں میں ایسے بدبخت کے خلاف خون نہیں اتر آئے گا اور وہ کونسا سینہ ہے جس میں ایسے شخص کے تصور سے انتقام کی آگ نہیں بھڑکے گی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس تحریر میں کسی کا نام نہیں لیا (اور اسی سے ان کی اخلاقی جرأت کا اندازہ لگ سکتا ہے) لیکن جو کچھ کہا گیا ہے ظاہر ہے اس کا مشارٌ الیہ پرویز صاحب کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

پرویز صاحب کی قرآنی تعلیم نے ہمارے دلوں سے شخصیت پرستی کے جذبات دور کر دئیے ہیں اس لئے اس ضمن میں مجھے ان کی وکالت یا مدافعت مقصود نہیں میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ الزام کس قدر کذب و افترا پر مبنی ہے۔ پرویز صاحب نے کراچی میں اپنے درسِ قرآن کا آغاز ۱۹۵۳ء میں کیا اور یہ سلسلہ ۱۹۵۵ء

تک جاری رہا ہم نے ڈاکٹر عبداللہ صاحب کو کبھی اس درس میں نہیں دیکھا۔ لاہور میں درس کا سلسلہ ۱۹۵۵ء سے جاری ہے اور یہاں کے احباب کا بھی یہی کہنا ہے کہ انہوں نے بھی آجتک ڈاکٹر صاحب موصوف کو کبھی درس میں نہیں دیکھا۔ پرویز صاحب نے مجھے بتایا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کبھی آج تک ان سے نہیں ملے۔ انہوں نے انکی شکل تک نہیں دیکھی۔ اس سے واضح ہے کہ ڈاکٹر صاحب، پرویز صاحب کی جن مجلسوں کا ذکر کرتے ہیں ان کا انہیں ذاتی طور پر کوئی علم نہیں۔ اگر وہ ان مجالس میں کبھی ایک مرتبہ بھی شریک ہوتے ہوتے تو وہ کم ازکم اتنا تو دیکھ لیتے کہ میر مجلس کا سینہ عشق رسول سے کس قدر گداز ہے اور حضورؐ کا اسم گرامی لبوں تک آتے ہی اس کی آنکھیں کس طرح نم آلود ہو جاتی ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ آج سے پانچ سال قبل کراچی کے احباب نے محترم پرویز صاحب کے درس قرآن کریم کے اختتام پر جشن مسرت منایا تو بارہ سال درس سننے کے بعد میں نے اس کے ماحصل کو ان الفاظ میں پیش کیا تھا۔ "محترم پرویز صاحب کا ہم پر یہ عظیم احسان ہے کہ موصوف نے سیرت محمدیہ کے جگمگاتے چراغ کو توہمات و معتقدات کے دبیز پردوں سے نکال کر اندھیروں میں بھٹکنے والی روشنی کے لئے مضطرب و بیقرار انسانیت کی ارتقاء کے لئے عام کر دیا۔ پرویز صاحب نے نوع انسانی کے اس محسن اعظم اور آسمانی انقلاب کے اس داعی اکبر کی سیرت مقدسہ کے ایسے گوشوں کو ابھار اور نکھار کر پیش کیا ہے، بلکہ یوں کہئے کہ حضورؐ کی عائلی، معاشرتی، تمدنی اور سیاسی زندگی کے ہر ہر پہلو کو ایسے دل نشیں انداز میں ذہن نشین کرایا ہے جس سے ہر ذی ہوش اور حساس انسان کے دل میں اس ذات اقدس و اعظم کا حقیقی احترام اور لازوال محبت جاگزیں ہو جاتی ہے اور سننے والا بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ اگر قرآن حروف و نقوش کی صورت میں شرف انسانیت کی انتہائی بلندیوں کا ترجمان ہے تو سیرت محمدیہ ان ہی بلندیوں کا چلتا پھرتا حسین پیکر اور دنیا میں قرآن کی تفسیر ناطق ہے۔

اب رہا ڈاکٹر صاحب کا علم بذریعہ مطالعہ سو میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب نے کم ازکم اس موضوع پر پرویز صاحب کی کسی تحریر کی ایک سطر تک نہیں پڑھی۔ یوں تو پرویز صاحب کا کون سا مقالہ اور ان کی کون سی کتاب ایسی ہے جس میں بالواسطہ یا بلاواسطہ حضورؐ نبی اکرم کا ذکر خیر نہ آجاتا ہو۔ لیکن انہوں نے حضورؐ کی سیرت طیبہ کے متعلق خصوصیت سے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی ہزارہا صفحات پر مشتمل ہے سیرت پر ان کی مستقل تصنیف کا پہلا ایڈیشن بڑے سائز کے قریب نو سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے جس کے متعلق ارباب ذوق کی رائے ہے کہ کم ازکم اردو لٹریچر میں وہ اپنے انداز کی منفرد کوشش ہے۔ کتاب دیکھنا تو ایک طرف اگر ڈاکٹر صاحب اس کا نام ہی کہیں سن لیتے تو وہ یہ کہنے کی جرأت نہ کرتے جو کچھ انہوں نے اپنے مقدمہ میں کہا ہے۔ اس کتاب سیرت کا نام ہے — معراج انسانیت — جو شخص حضورؐ کی سیرت کو معراج انسانیت قرار دیتا اور ثابت کرتا ہے' اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ رسول کا منکر اور حضورؐ کی شخصیت کی اہمیت گھٹانے پر مامور ہے' ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب ہی کو زیب دے سکتا ہے

پرویز صاحب کی تعلیم کی روشنی میں ہماری تحریک سال میں دو نمایاں تقاریب مناتی ہے۔ ایک جشنِ نزولِ قرآن اور دوسری عید میلاد النبی۔ جن احباب کو ان تقاریب میں پرویز صاحب کے خطابات سننے کا اتفاق ہوا ہے وہ ان کی کیفیت بارِیوں اور سرور انگیزیوں کی شہادت دے سکتے ہیں۔ یہ خطابات ان کے مضامین کے مجموعوں اور سلیم کے نام خطوط میں شامل ہیں جس کا جی چاہے دیکھ لے۔ وہ اپنے ایک خطاب میں کہتے ہیں:-

> میرے نزدیک دنیا کے لئے جشنِ مسرت کی تقریبات دو ہی ہیں۔ ایک نزولِ قرآن کی عید اور دوسری عید میلاد النبی۔ اور یہ دونوں تقریبات بھی ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں اور ایک ہی اصل کی دو شاخیں۔ اس لئے کہ نہ رسول اللہ کو قرآن سے الگ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی قرآن کو رسول اللہ سے الگ۔ قرآن قلبِ محمدی پر نازل شدہ وحیِ خداوندی کا نام ہے اور رسول اللہ قرآنی سیرت کا درخشندہ پیکر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے صرف احکام و قوانین ہی عطا نہیں کئے بلکہ سیرتِ محمدؐ کے اصولی گوشوں کو بھی اپنے دامن میں محفوظ کر لیا ہے۔
>
> (سلیم کے نام خطوط۔ حصہ دوم صفحہ ۱۱)

وہ دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:-

> ذرا سوچو کہ جب ایک مسلمان کہتا ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے تو اس کے پاس اس دعویٰ کی دلیل کیا ہے کہ قرآن واقعی خدا کا کلام ہے (معاذ اللہ) رسول اللہ کا خود ساختہ نہیں۔ تاریخ شاہد ہے (اور اس کا انہیں بھی اقرار ہے کہ) دنیا کو قرآن محمدؐ ابن عبداللہ نے دیا تھا۔ پھر یہ خدا کا کلام کیسے ہوا! اس کا صرف ایک ہی ثبوت ہے اور وہ یہ کہ خود محمدؐ ابن عبداللہ نے یہ کہا ہے کہ یہ میرا کلام نہیں، خدا کا کلام ہے۔ اس لئے جب تک کوئی شخص محمد الرسول اللہ کی صداقت پر ایمان نہ لائے قرآن کے منزل من اللہ ہونے پر ایمان نہیں لا سکتا۔
>
> (سلیم کے نام خطوط۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۸۹)

مقامِ محمدی ان کا ایک معرکہ آرا مقالہ ہے جو سلیم کے نام خطوط جلد دوم میں شامل ہے۔ وہ اس کے آخر میں لکھتے ہیں:-

> اس حقیقت کو سلیم! اچھی طرح سن رکھو اور ساری دنیا کو سنا دو کہ انسان جو جی میں آئے کر کے دیکھ لے۔ اس کی نجات و سعادت کی صرف ایک راہ ہے۔ یعنی وہ راہ جو مقامِ محمدی پر ایمان سے متعین ہوتی ہے اور جس کی طرف پیامِ محمدی راہ نمائی کرتا ہے۔
>
> اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

سنیے کہ وہ اپنے ایمان کے متعلق کیا اعلان کرتے ہیں۔ وہ (معراجِ انسانیت میں) کہتے ہیں کہ:-

> میرا ایمان ہے اور میں اس ایمان کے سہارے زندہ ہوں کہ اگر آج بھی قرآن سے ان تو برتو پردوں کو الگ کر دیا جائے جو انسانی تصورات نے اس پر ڈال رکھے ہیں اور سیرتِ محمدیہ کو ان حشو و زوائد سے پاک کر دیا جائے جو ہماری ناعاقبت اندیشیوں اور غلط عقیدت مندیوں

نے اس ذاتِ اقدس و اعظم کی طرف منسوب کر رکھے ہیں تو اندھیرے میں بھٹکنے والی انسانیت اب بھی زندگی کی اس متوازن و ہموار راہ پر لگ سکتی ہے جو اسے سیدھے شادابیوں اور کامرانیوں کی جنت کی طرف لے جانے والی ہے اسلئے کہ قرآن کا مقصود انسانیت سازی ہے جس کا مشہود پیکر ذاتِ محمدی ہے (لیکن وہی پیکر جسے قرآن نے پیش کیا ہے) جب تک دنیا اس مقام تک نہیں پہنچ جاتی شرف و مرتبت کی فیروزمندیاں اس کے حصے میں نہیں آسکتیں اور اس مقام تک پہنچنا اسی صورت میں ممکن ہے کہ قرآن اور سیرت صاحبِ قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) دنیا کے سامنے اپنی شکل میں آجائے۔ (معراج انسانیت (طبع اول، ص ۳۸)

اس کتاب کا ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔ لکھتے ہیں۔

یہ ایک واقعہ نفس الامری کا اظہار ہے کہ دنیائے انسانیت میں آج جو کچھ قابلِ حمد و ستائش اور درخورِ تحسین و تبریک نظر آتا ہے وہ اسی وجہ سے ہے کہ وہ بالواسطہ ایک نسبت رکھتا ہے ذاتِ محمد رسول اللہ سے اور جو انسان چاہتا ہے کہ وہ درخورِ ستائش ہو جائے وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی کوشش میں ہے کہ اس راستہ پر چل نکلے جو سیرتِ محمدیہ نے دنیا میں متعین کر کے دکھایا۔

(معراج انسانیت۔ ص ۷۸۴)

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے "معراجِ انسانیت" سیرتِ طیبہ پر ایک منفرد کتاب ہے۔ اگر آپ احباب کو اتنی فرصت نہ ہو کہ اس کتاب کو پورے کا پورا پڑھ سکیں تو میں اتنا ضرور کہوں گا کہ آپ اسکے اس باب کا مطالعہ ضرور کر لیا جس میں نبی اکرمؐ کے ظہورِ قدسی کا تذکرہ جلیلہ ہے (جس کا عنوان ہے "صبحِ بہار")۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ باب شرف یہ کہ دنیائے ذوق و شوق کی کس قدر رعنائیاں اور جہانِ وجد و کیف کی کتنی زیبائیاں اپنے آغوش میں لئے ہے۔ بلکہ یہ بھی کہ وہ اُردو ادب کا بھی کیا حسین و جمیل شاہکار ہے وقت ہوتا تو میں وہ پورے کا پورا باب آپ کے سامنے پیش کرتا لیکن اب میں انہی الفاظ پر اکتفا کروں گا جن پر اس باب کا خاتمہ ہوتا ہے غور سے سنیئے اور جھوم جھوم جایئے۔ کہا ہے۔

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسانوں کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدۂ بینا پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفےٰ رو!

یہ ہیں حضورؐ خاتم النبیین کی ذاتِ اقدس کے متعلق عقیدت و احترام کے جذبات اس شخص کے جس پر منکرِ رسول ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ باقی رہا اس الزام کا دوسرا حصہ کہ یہ شخص اپنے آپ کو حضرت عمرؓ اور ابوبکرؓ

سے بھی بہتر مفسر سمجھتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلہ میں اتنا ہی کافی ہوگا کہ میں آپ کے سامنے ان الفاظ کو پیش کر دوں جنہیں پرویز صاحب اپنی ہر تصنیف کے آخر میں لکھا کرتے ہیں۔ وہ الفاظ یہ ہیں۔

> میں اس حقیقت کا اعادہ ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہو سکتا کہ وہ سہو و خطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لہٰذا میری تحریرات میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے وہ نورِ قرآن کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو و خطا دکھائی دے وہ میرے ذہن کی نارسائی۔
>
> (معراجِ انسانیت صفحہ ۳۴)

میں آخر میں اتنا عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ پرویز صاحب کے خلاف جس قدر پروپیگنڈہ کیا گیا ہے اس سے نہ انہیں کوئی نقصان پہنچا ہے اور نہ ہی ہماری تحریک کو کسی قسم کا خسران۔ یہاں تو سب کچھ بغیر کسی ذاتی مفاد کے خیال کے صرف قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے ہوتا ہے۔ اس لئے اس قسم کی افترا پردازی سے ہمیں کیا نقصان پہنچے گا۔ اس سے سارا نقصان ہماری قوم کو پہنچا ہے اور یہ نقصان اتنا بڑا ہے کہ اس کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔ قیامِ پاکستان کے بعد ضرورت تھی کہ ہماری نئی نسل کے سامنے دین اپنی حقیقی شکل میں آ جاتا۔ اس سے نہ صرف یہ کہ ہمارے ان نونہالانِ امت کے قلب و دماغ کی تعمیر صحیح خطوط پر ہو جاتی بلکہ پاکستان بھی وہی کچھ بن جاتا جو کچھ بننے کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا۔ دین کا یہ حقیقی تصور پرویز صاحب کی قرآنی فکر کی رو سے سامنے آ سکتا تھا۔ ان کے خلاف پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم کا یہ طبقہ ان کی فکر سے محروم رہ گیا۔ ان کے نام کو ایسا (WET PAINT) بنا دیا گیا کہ ہر شخص ان سے دور رہنے ہی میں اپنی عافیت سمجھنے لگا۔ اگر پرویز صاحب کے خلاف یہ پروپیگنڈہ نہ ہوتا اور ان کی کتابیں تعلیم کے نصاب میں شامل ہو جاتیں تو آج قوم کو وہ رونا نہ رونا پڑتا جو رونا وہ اپنی نئی نسل کی بے راہ روی کے ہاتھوں رو رہی ہے۔ یہ وہ نقصانِ عظیم ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ سوچئے کہ ملوکیت سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کی مفاد پرستیاں اپنے وقتی فائدوں کی خاطر قوم کو کتنے بڑے تباہیوں کے غاروں میں دھکیل دیتی ہیں۔

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے !!
فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

(پیٹر)

لاہور میں محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

ہر اتوار - صبح ۹½ بجے

بمقام ۲۵/بی - گلبرگ ۲ - لاہور

ادارہ طلوعِ اسلام .... ٹیلیفون (۸۰۸۰۰)

نایاب کتابوں کے نئے ایڈیشن

پرویز صاحب کے سلسلۂ معارف القرآن کی ابتدائی کتابوں اور ادارہ طلوع اسلام کی کچھ اور کتب کے سابقہ ایڈیشن ختم ہو چکے تھے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل کے جدید ایڈیشن مصنف کی نظرثانی کے بعد پھر سے شائع ہو چکے ہیں :-

ابلیس و آدم

یہ کتاب دین کے بنیادی تصورات پر مشتمل ہے۔ مثلاً انسان کی پیدائش اور کائنات میں اس کا مقام، قصۂ آدم اور نظریۂ ارتقاء، ملائکہ، ابلیس، شیطان اور جنات کی حقیقت۔ وحی کی غرض و غایت، مقام نبوت و منصبِ رسالت جیسے موضوعات کی بصیرت افروز تشریح۔

قیمت - مجلد گرد پوش :- پندرہ روپے ۱۵ (علاوہ محصولڈاک)

جوئے نور

یہ ابلیس و آدم کے سلسلے کی دوسری کتاب ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ تاریخ اور قرآن کا باہمی تعلق، اقوامِ سابقہ کی داستانوں کے بیان کا مقصد اور فلسفۂ مارکس اور قرآنی نظریہ کا بنیادی فرق کیا ہے۔ ان تفصیلات کے بعد حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت شعیبؑ تک کے انبیاء کرام کے تذکارِ جلیلہ، سابقہ قوموں کی تباہی کے اسباب، عذابِ خداوندی، نظریۂ قومیت، ہجرت، معاشی نظام کی قرآنی تشریح۔ ایسے اہم موضوعات پر سیر حاصل بحث اور دلنشیں پیرایۂ بیان۔

قیمت - مجلد گرد پوش - پندرہ روپے ۱۵ (علاوہ محصولڈاک)

اسلامی معاشرت

مفکرِ قرآن نے اس کتاب میں روزمرہ کی زندگی کے متعلق قرآنی احکام و ہدایات نہایت آسان اور دلکش انداز میں بیان کر کے بتلایا ہے کہ اسلام کسے کہتے ہیں اور قرآن کی رُو سے مسلمانوں کا معاشرہ کس قسم کا ہونا چاہیے۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اگر ہمارے ابتدائی سکولوں میں یہ بطور نصاب شامل کر دی جائے تو قوم کی تقدیر بدل سکتی ہے۔

(قیمت :- چار روپے ۴ (علاوہ محصولڈاک)

طاہرہ کے نام خطوط

ایک شفیق باپ اور غمخوار معلم کی حیثیت سے جناب پرویز نے اس کتاب میں ملت کی طاہرہ بیٹیوں کو اپنے مخصوص مشفقانہ انداز سے خطاب کیا ہے اور بتلایا ہے کہ دینِ خداوندی انہیں کس قدر بلند مقام عطا کرتا ہے اور مردوں کے دوش بدوش چلنے کی تاکید کرتا ہے۔ اس کتاب نے خواتینِ امت کے حلقۂ نگاہ میں نہایت خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

قیمت :- چھ روپے (علاوہ محصولڈاک)

عربی خود سیکھئے

اس کتاب کے دو ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ ختم ہو چکے تھے تازہ ایڈیشن میں ہر باب کے ساتھ عربی لغت کے الفاظ کے اضافہ سے اس میں عربی زبان کے تقریباً تمام عام طور پر مستعمل الفاظ آ گئے ہیں۔ ہمارے نوجوانوں میں قرآن کریم کو خود سمجھنے کے لئے جو تڑپ پائی جاتی ہے اس کی تسکین کے لئے یہ مختصر اور سلیس کتاب نہایت مفید ثابت ہو گی۔

قیمت :- چھ روپے - (علاوہ محصولڈاک)

ملنے کا پتہ :-

مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور • ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

ارباب فکر و نظر کیلئے

کراچی میں

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

ہر اتوار کی صبح ۹½ بجے (بذریعہ ٹیپ) دفتر بزم طلوع اسلام
۱/۳ فردوس مارکیٹ (بالمقابل بس سٹاپ پہلی چورنگی) ناظم آباد
میں ہوتا ہے۔ اسکے علاوہ ۔۔ بزم کے دفتر میں

☆ طلوع اسلام لائبریری کے اوقات مطالعہ ۔۔ روزانہ بجز اتوار ۔۔ ۷ تا ۹ بجے شب ہیں۔

☆ ماہنامہ طلوع اسلام ۰ پرویز صاحب کے خصوصی خطابات کے پمفلٹ

☆ اور جملہ مطبوعات ادارۂ طلوع اسلام کے بارے میں معلومات کے لئے

☆ دفتر کا ٹیلیفون نمبر ۶۱۰۴۶۸ نوٹ فرمائیں۔

محمد اسلام۔ نمائندہ بزم طلوع اسلام کراچی

لاہور میں سپیئر پارٹس کی مشہور دکان

سٹینڈرڈ آٹوموبائلز

پر تشریف لائیے!

ڈیلرز:- موٹر پارٹس
ٹرک (ڈیزل) پارٹس
سپیشلسٹ: ڈاج، بیڈفورڈ، لی لینڈ،
بی۔ایل۔ایم۔سی

۱۳۵ - بادامی باغ - لاہور

Beautiful Full - Color

PAINTINGS
&
REPRODUCTIONS

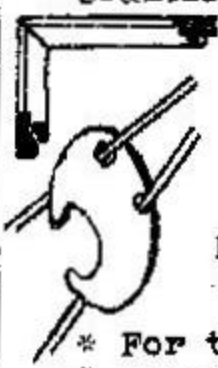

* For the HOME
* ------ OFFICE
* ------- SCHOOL
* -------- LIBRARIES

TO FRAME - TO STUDY - TO ENJ[illegible]

VISIT

ART GALLER[illegible]

17-E, MAIN MARKET, GULBERG
LAHORE - PAKISTAN.

Surround Yourself With Beaut[illegible]

باسمہٖ تعالیٰ

روئیداد

مرتبہ:۔ غلام صابر

طلوعِ اسلام سالانہ کنونشن

۲۳ نومبر تا ۲۶ نومبر ۱۹۷۲ء بروز جمعرات تا اتوار

نہ تیز اتنی چلے سر پھری ہوا سے کہو
شجر پہ ایک ہی پتہ دکھائی دیتا ہے

ملک میں فکری خلفشار اور ذہنی آوارگی کے نتیجہ میں، جو تباہی اور بربادی ہو رہی ہے اُس سے ہر قلبِ حساس نہ صرف پریشان ہے بلکہ اِس اضطراب و پریشانی کا کوئی مداوا بھی چاہتا ہے۔ اجتماعی طور پر یہ آواز' ہمارے دل کی آواز ہے کہ ہماری سوختہ بختی کی وجہ بتائی جائے اور پھر اس سے بچ نکلنے کا صحیح راستہ بھی۔ اس پس منظر میں طلوعِ اسلام کی تحریک وہ بنیادی اینٹ ہے جو سطحی نگاہوں کی توجہ کا مرکز تو نہیں لیکن ارباب فکر و نظر کے نزدیک اس کی اہمیت ایسی ہے کہ اگر اس بنیادی اینٹ پر عمارت کو استوار نہ کیا گیا تو مستقبل اس سے بھی زیادہ تاریک ہوتا چلا جائے گا اور ملتِ اسلامیہ راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جائے گی۔ طلوعِ اسلام کے سالانہ کنونشن ملت کو راکھ کا ڈھیر بننے سے بچانے ہی کی تدابیر کی ایک کڑی ہے۔ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک کے مندوبین اس میں شرکت کرتے ہیں اور اس کے اجلاس نہایت متانت اور سنجیدگی سے بغیر کسی شور غوغا آرائی اور جذباتی نعرہ بازی کے منعقد ہوتے ہیں۔ امسال یہ اجلاس حسبِ سابق ۲۵۔بی گلبرگ ۲ اور اس کے سامنے کھلے میدان میں ہوئے۔

۲۲ نومبر بدھ کی شام' سب سے پہلے بزم کوئٹہ کے احباب آئے۔ اُن کے ہمراہ تحریکِ طلوعِ اسلام کے جانثار رفیق محترم قدیر احمد خانصاحب بھی تھے جو پچھلے سال ایک حادثہ کا شکار ہونے کی وجہ سے شدید زخمی ہو گئے تھے اور کنونشن میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ پرویز صاحب نے انہیں دیکھا تو بے ساختہ گلے سے لگا لیا اور پھر آنسوؤں کا رواں سلسلہ دردمندیوں کا استقبالیہ بن گیا۔

جمعرات (۲۳ نومبر) کی صبح' دور دراز سے احباب تشریف آ رہے تھے۔ اس بار کراچی کے احباب ایک روز قبل تشریف لانے کی دیرینہ روایت کے برعکس دوپہر کے وقت پہنچے۔ ان روایت شکن ساتھیوں کا جوش اور ولولہ کنونشن میں تازگی پیدا کر دیتا ہے۔ بزم کراچی کی خواتین سٹال لگا کر، پروگرام کی رونق کو دوبالا کر دیتی ہیں۔

تحریک کے دیرینہ ساتھی محترم خواجہ محمد حسین صاحب رضوان کنونشن' ان سب مندوبین کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

کو پنڈال سے ناظم ادارہ محترم مرزا محمد خلیل صاحب نے مطلع میں دوپہر کا کھانا تیار ہونے کی خوش خبری سنائی ۔ مطبخ کا سارا انتظام، تحریک طلوع اسلام کے جواں ہمت ساتھی محترم محمد رشید صاحب نے اپنے ذمہ لیا ہوتا ہے ۔ اور ان کا حسن انتظام اور کھانوں میں حسن ذوق سے تمام احباب متاثر ہوتے ہیں ۔ ابھی یہ سلسلہ ختم نہ ہوا تھا کہ پنڈال سے خلیل صاحب کی دوسری آواز آئی کہ احباب، کھانے سے فارغ ہو کر پنڈال میں تشریف لے آئیں تاکہ پہلا اجلاس شروع کیا جائے ۔ اس آواز کو سنتے ہی، پنڈال میں آمد شروع ہو گئی اور پھر وسیع و عریض پنڈال کا کافی حصہ مندوبین نے سنبھال لیا ۔

۲۳ر نومبر ۱۹۷۲ء　　　　دوپہر
جمعرات　　　　سوا دو بجے

بزموں کا پہلا اجلاس

صدارت :- محترم خان بخت جمال خان صاحب ،　　　تلاوت :- محترم حافظ عبدالمجید صاحب

سٹیج سیکرٹری :- محترم مرزا محمد خلیل صاحب ۔　　　کلام اقبال - محترم مرزا محمد خلیل صاحب

اس اجلاس کے صدر تحریک پاکستان کے اُن غازیوں میں سے ہیں جنہوں نے سرحد میں مسلم لیگ کو ایک عوامی جماعت بنایا تھا ۔ وہ سرحد مسلم لیگ کے پہلے صدر تھے اور آج بھی اگر سرحد میں صدر صاحب کہا جائے تو لوگوں کو خان بخت جمال خان کا چہرہ ہی نظر آتا ہے ۔ انہوں نے اپنی روایتی زوردار آواز میں کہا کہ

"اب خلیل صاحب، اقبال صاحب کا نظم سنائیں گے ۔"

اُن کے اس فقرے پر احباب کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی — یہ مسکراہٹ محترم خلیل صاحب کی درد انگیز اور پُرسوز آواز سے فضا میں تحلیل ہو گئی — انہوں نے جب اقبال کی یہ غزل پڑھی کہ

پوچھ اس سے کہ مقبول ہے فطرت کی گواہی
تو صاحب منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی

اس غزل کا ایک ایک شعر قرآنی جانثاروں کے اس اجتماع کے دل و دماغ پر عجیب تاثر پیدا کر رہا تھا ۔ جب وہ اس شعر پر پہنچے تو نہ جانے کیوں کئی بزرگ، عمر لوگ، اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ رہے تھے اور نوجوانوں، قرآن کے شیدائیوں میں سے نوجوان احباب کے چہروں پر خون کی سرخی پھیل گئی — شعر یہ تھا کہ

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلمان
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

اس کے بعد اس غزل کا آخری شعر پڑھا گیا ۔

میں نے تو کیا پردۂ اسرار کو بھی پاک ؛ دیرینہ ہے تیرا مرض کور نگاہی

طلوع اسلام کنونشن کے یہ اجلاس، جہاں پردۂ اسرار کو چاک کرتے ہیں ۔ وہاں اس قوم کے کورنگاہی کے دیرینہ مرض کا علاج بھی تلاش کرتے ہیں — اس کا آغاز بزم طلوع اسلام لاہور کے جواں ہمت نمائندہ

استقبالیہ بزم لاہور

محترم پروفیسر خالد اسلام صاحب نے استقبالیہ سے کیا۔ انہوں نے اپنے استقبالیہ میں کہا کہ سال میں دو عیدیں آتی ہیں، اس سال کنونشن چھ ماہ کے بعد منعقد کی گئی ہے۔ اب یہ کیسے کہا جائے کہ ان میں سے چھوٹی عید کون سی ہے اور بڑی عید کون سی۔ ایک کونے سے پرویز صاحب کی بے ساختہ آواز آئی کہ جس میں قربانی ہوگی وہی بڑی عید ہوگی۔۔۔! احباب مفکر قرآن کی فی البدیہہ معنی خیز خوش مذاقی کی داد دے رہے تھے۔

خالد اسلام صاحب نے استقبالیہ میں کہا کہ اس کنونشن میں میزبانی کے فرائض اگرچہ لاہور بزم ہی ادا کرتی ہے لیکن اس بار بزم ملتان اور بزم لائلپور نے بھی مالی اعانت کی ہے۔ انتظام میں اگر کہیں کوئی نقص اور سقم نظر آئے تو اس کی اطلاع رضوانِ کنونشن محترم خواجہ محمد حسین صاحب کو دی جائے تاکہ اس کا فوری تدارک کیا جا سکے۔ اور اگر کوئی سقم ہماری مجبوری کی وجہ سے ہو تو اُسے آپ فراخ دلی سے برداشت کریں۔ ہم اس کے لئے پیشگی معذرت بھی قبول فرمائیں۔

رپورٹ ناظم ادارہ

محترم مرزا محمد خلیل صاحب نے ادارہ کی کارکردگی کی سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ اب قرآن کی انقلابی آواز بیرونِ ملک بھی اپنا حلقہ اثر وسیع سے وسیع تر کر رہی ہے۔ یہ امر احباب کے لئے مسرت کا باعث ہے۔ اس رپورٹ میں ادارہ اور بزموں کی کارکردگی کا جائزہ لے کر آئندہ کے پروگرام کا خاکہ پیش کیا گیا تھا۔

رپورٹ کے بعد صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان سے آئے ہوئے مندوبین نے قرآنی آواز کو پھیلانے کے بارے میں اپنی سرگرمیوں اور اپنی اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کی۔ مشکلات اور موانعات پر قابو پانے کے لئے ہمت، جوش اور شوق، ان احباب کے لب و لہجہ سے عیاں ہوتا تھا۔۔۔ اور یوں نظر آتا تھا کہ اگر یہ احباب اسی عزم و ہمت سے آگے بڑھتے گئے تو یہ ملک یقیناً شمعِ قرآنی کے نور سے جگمگا اٹھے گا۔ آگے بڑھتے چلے جانے اور قرآن کی آواز کو عام کرنے کا عزم آرزوؤں کی تکمیل کی دلیل بن رہا تھا۔ بزموں کے اس اجلاس کی یہی تلخیص ہے۔۔۔ شام ہو رہی تھی اور شام ڈھلتے ہی مفکر قرآن کا خطاب ہونا تھا اس لئے بزموں کی یہ پہلی نشست اختتام پذیر ہوئی۔

---

۲۳ نومبر ۱۹۷۹ء
جمعرات

شام ۵ بجے
(بعد نماز مغرب)

پہلا کھلا اجلاس

صدارت: محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب — تلاوت: محترم حافظ عبدالمجید صاحب

سٹیج سیکرٹری: محترم پروفیسر خالد اسلام صاحب — نظم اقبال: محترم مرزا محمد خلیل صاحب

خطاب: محترم پرویز صاحب

اس اجلاس کے شروع ہونے سے پہلے ہی پنڈال بھر چکا تھا۔ مفکر قرآن نے اپنا خطاب پیش کیا۔

یہ خطاب اس قدر خیال افروز اور فکر انگیز تھا کہ پنڈال میں جذب و جوش کے مظاہرے بار بار ہو رہے تھے۔ حالات کو قرآن کی نگاہ سے دیکھ کر سمجھنے اور انہیں بدلنے کے لئے مسلسل کوشش کرنے کا عزم ہر دل میں زیادہ شدت اختیار کر رہا تھا۔ (چونکہ یہ خطاب طلوع اسلام بابت ماہ دسمبر ۷۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اس لئے اس کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں)

پرویز صاحب کے بعد صدر جلسہ محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مفکر قرآن کے بارے میں کہا کہ ان میں خداداد صلاحیت ہے اور وہ مسائل کو اتنی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ مفکر قرآن کی شخصیت نئی نسل کے لئے چراغِ راہ ہے اور وہ اسقدر مستقل مزاجی اور بلند ہمتی سے قرآن کی خدمت کر رہے ہیں کہ یوں نظر آتا ہے جیسے پیرانہ شباب زندگی کی ساری توانائیاں ان میں سمٹ کر آگئی ہیں۔ اس کے بعد جلسہ ختم کرنے کا اعلان کیا گیا۔

۲۳ر نومبر ۷۲ء جمعرات — رات نو بجے

قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کا اجلاس

صدارت: محترم پرویز صاحب۔ (چیئرمین قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی)

سٹیج سیکرٹری: محترم شیخ سراج الحق صاحب۔ (سیکرٹری، قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی)

قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کی سالانہ رپورٹ محترم شیخ سراج الحق صاحب نے پیش کی اور کالج کے قیام کے سلسلے میں حکومت کی پالیسی اور دیگر موانعات کا بالتفصیل ذکر کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے تجویز پیش کی کہ بیرون ملک اور اندرون ملک پوسٹ گریجویٹس کو تعطیلات کے دوران ریسرچ کے لئے سوسائٹی کی طرف سے انتظام کیا جائے اور یہ سارا کام پرویز صاحب کی زیر نگرانی ہو۔ مختلف یونیورسٹیوں سے اس بارے میں رابطہ قائم کیا جائے گا۔ اس تجویز کی افادیت پر تمام احباب متفق تھے۔ یہ اجلاس رات گئے تک جاری رہا۔

۲۴ر نومبر ۷۲ء جمعہ — صبح ۹ بجے

بزموں کا دوسرا اجلاس

صدارت: محترم اقبال سرور صاحب — تلاوت: حافظ عبدالحمید صاحب

سٹیج سیکرٹری: محترم مرزا محمد [illegible] ایل صاحب — کلام اقبال: محترم مرزا محمد خلیل صاحب

بزموں کے اجلاس میں پرویز صاحب عموماً کم ہی شرکت کرتے ہیں لیکن اس اجلاس کے شروع ہی میں وہ اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرنے کے لئے سٹیج پر آئے۔ انہوں نے نہایت دل سوزی سے صورت حال

کا ذکر کیا اور کہا کہ آپ احباب کی معاونت اور خدمتِ قرآنی کے جذبوں کی بدولت میری زندگی بڑھ جاتی ہے۔ اور مجھے کبھی مایوسی نہیں ہوئی۔ قرآن کے خلاف' پاکستان بننے سے پہلے جو حملے ہوتے تھے وہ بالعموم بیرونی دشمنوں کی طرف سے ہوتے تھے۔ لیکن اب پاکستان میں یہ حملے چاروں طرف سے ہو رہے ہیں۔ اور حد یہ ہے کہ حق کی بات زبان پر لانے سے' دھمکیوں کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہے۔ اس فضا میں قرآنی روشنی کو عام کرتے چلے جانا ہی ہماری زندگی ہے، ورنہ زندگی کا کوئی دوسرا مفہوم نہیں ہے! مفکرِ قرآن کی آواز میں اس قدر درد و سوز تھا کہ کئی بار آنسوؤں کی جھلمل احباب کے چہروں پر دکھائی دی۔

اس کے بعد نمائندگان نے اپنے اپنے ذمہ لی ہوئی ذمہ داریوں کے بارے میں اظہارِ خیال کیا اور تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے پروگرام بنایا۔ یہ بحث ابھی جاری تھی کہ بارش کے قطروں کا قافلہ نمودار ہوا۔ اور پھر آناً فاناً بارش سے پنڈال تر بتر ہو گیا۔ احباب اٹھے اور محترم شیخ سراج الحق صاحب کے کاشانہ ۳۵ ماربل گلبرگ میں اپنی میٹنگ شروع کی۔ اور دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ احباب نے اس طویل نشست کے بعد کھانا کھایا اور نمازِ جمعہ کی تیاری شروع کی۔ جمعہ کی نماز قریبی مساجد میں ادا کی گئی۔ اور نماز کے بعد دوسرا کھلا اجلاس شروع ہوا۔ کنونشن میں ہمیشہ اس کا التزام کیا جاتا ہے کہ نمازیں مساجد میں جا کر ادا کی جائیں' پنڈال یا ادارہ کے احاطہ میں نہ کی جائیں کیونکہ اس سے فرقہ بندی کی جھلک کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے جو قرآن کی رُو سے شرک ہے اور جس کی مخالفت تحریکِ طلوعِ اسلام شدت سے کرتی چلی آ رہی ہے۔

جمعہ ۲۴ نومبر ۷۲ء　　　　　　ساڑھے ۲ بجے دوپہر (بعد از نمازِ جمعہ)

دوسرا کھلا اجلاس

صدارت :- محترم ظفر حسن محمود صاحب　　　　تلاوت :- محترم حافظ عبد المجید صاحب

سٹیج سیکرٹری :- محترم خالد سلام صاحب　　　　کلامِ اقبال :- محترم مرزا محمد خلیل صاحب

صبح بارش کی وجہ سے پنڈال میں پانی بھر گیا تھا۔ لیکن احباب نے نہایت تیزی سے سارے پنڈال کو دوبارہ اسی طرح سجا دیا اور اس طرح یہ اجلاس بادلوں کے یلغار میں شروع کیا گیا۔ اس اجلاس کا موضوع تھا۔

"بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل"

اس میں محترم حسن عباس رضوی صاحب، محترم چوہدری عطا اللہ صاحب اور محترمہ شمیم انور صاحبہ نے علی الترتیب قانون کا احترام، پاکستان کی تعلیمی پالیسی اور تہذیبِ فرنگ کے موضوعات پر اظہار کرنا تھا۔ پروگرام میں معمولی سی تبدیلی کی گئی اور محترم پروفیسر علاؤ الدین اختر صاحب نے بھی تعلیمی پالیسی پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ پروگرام میں یہ اضافہ نہایت خوشگوار ثابت ہوا۔ بارش کی وجہ سے محترم چوہدری عطا اللہ صاحب کا مقالہ آئندہ اجلاس پر اٹھا دینا پڑا۔

---

۲۴ نومبر ۷۲ء
جمعہ

۵½ بجے شام
(بعد نماز مغرب)

تیسرا کھلا اجلاس

صدارت :- محترم میجر جنرل (ریٹائرڈ) شیریں دل خان نیازی صاحب ، تلاوت :- حافظ عبدالمجید صاحب

سٹیج سیکرٹری :- پروفیسر خالد اسلام صاحب ، کلام اقبال :- مرزا محمد خلیل

کنونشن کی تاریخیں مقرر کرنے سے پہلے گذشتہ چار پانچ سال کی موسمیاتی رپورٹوں کی رُو سے اس امر کا اطمینان کر لیا گیا تھا کہ نومبر کے آخری ہفتہ میں لاہور میں موسم خشک رہتا ہے اس لئے بارش کا خطرہ نہیں تھا. لیکن سیاسی مطلع کی طرح اب موسموں کے متعلق یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا. چنانچہ جن تاریخوں میں گذشتہ چار پانچ سال میں مطلع ابر آلود تک نہ ہوا تھا، انہی تاریخوں میں کنونشن کے چاروں دن کسی نہ کسی وقت اچانک بارش نے آلیا. لیکن اس کے باوجود اس کا پروگرام جزئی تبدیلیوں کے سوا معمول کے مطابق حسن وخوبی سرانجام پا گیا۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے دوپہر کے اجلاس کو بارش نے آلیا تھا اور آخری لمحات میں اجلاس برخاست کرنا پڑا تھا. چونکہ بارش رُک گئی تھی اور مطلع صاف ہو گیا تھا اس لئے اس اجلاس کو ملتوی کرنے کے بجائے شروع کر دیا گیا. لیکن جونہی یہ اجلاس شروع ہوا اور محترم چوہدری عطا اللہ صاحب نے اپنا مقالہ پڑھنا شروع کیا پھر بارش آگئی - آسمان کی طرف لوگوں کی نگاہیں اُٹھ رہی تھیں اور ترشح کی حالت تک احباب نہایت دلجمعی سے گوش سماعت تھے لیکن بارش کے زیادہ تیز ہو جانے کی وجہ سے یہ اجلاس چوہدری صاحب کے مقالہ کے دوران ہی ملتوی کرنا پڑا. اس سے نہ صرف یہ کہ چوہدری صاحب کا مقالہ ہی محروم سماعت رہ گیا بلکہ پرویز صاحب بھی اپنا وہ معرکہ آرا خطاب پیش نہ کر سکے جس کا عنوان تھا ـــــ ہیں تو اک کچھ نظر آتے ہیں کچھ ـــــ اور جس سے مستفید ہونے کے لئے ارباب فکر ونظر دور دور سے تشریف لائے تھے. اس محرومی کا ہر ایک کو بے حد افسوس تھا.

---

۲۵ نومبر ۷۲ء
ہفتہ

صبح
۹½ بجے

بزموں کا تیسرا اجلاس

صدارت :- محترم محمد اسلام صاحب　　　تلاوت :- محترم عبدالمجید با حافظ صاحب

کلام اقبال :- محترم مرزا محمد خلیل صاحب

اس میں شبہ نہیں کہ شاعرانہ احساسات کو آواز میں منتقل کرنا بڑا مشکل ہے لیکن محترم مرزا محمد خلیل صاحب نے کلام اقبال کو جس سوز سے پڑھا، اس نے فضا احساسات کی دنیا کو نہایت کامیابی سے صوت میں بدل دیا. غزل کا مطلع تھا.

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے

اس کے بعد بزموں کے اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی اور قرآن کی آواز کو عام کرنے کے لئے مختلف تدابیر پر غور کیا گیا اور لائحہ عمل مرتب کیا گیا اور آئندہ کنونشن منعقد کرنے کے بارے میں بھی فیصلہ ہوا۔ قرار دادیں پیش کی گئیں۔

اس اجلاس کے بعد پرویز صاحب مائک کے سامنے آئے اور قافلہ قرآنی سے مخاطب ہوتے کہ آپ احباب رنگ، نسل اور خون کے رشتے توڑ کر قرآن کی جانب آئے ہیں۔ آپ کی یگانگت، محبت اور خلوص، ہم آہنگی قلب و نظر، ان تمام رشتوں سے زیادہ قوی، مضبوط اور گہری ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں یوں لگتا ہے جیسے ہم مدتوں سے ایک دوسرے سے مل رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے کردار سے قرآن کی روشنی کو پھیلائیں اور تحریک قرآنی کا ہر کارکن چلتا پھرتا قرآن کا مبلغ بن جائے۔ اس سے یہ آواز چاروں طرف پھیل جائے گی اور اس کی جڑیں نہایت گہری ہوں گی اور کوئی وقتی سیلاب اسے بہا کر نہیں لے جاسکے گا۔ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا یہی طریق سب سے زیادہ مؤثر ہے۔

بارش کی وجہ سے احباب کو رات کے اجلاس کے ملتوی ہو جانے کا افسوس تھا۔ اور ان کی خواہش تھی کہ پروگرام میں تبدیلی کر کے کسی نہ کسی طرح پرویز صاحب سے ملتوی شدہ خطاب کو سننے کی سبیل نکالی جائے۔ پرویز صاحب نے اس احساس کو بھانپ لیا اور اعلان کیا کہ اس کے لئے کنونشن میں توسیع کر دی جائے گی۔ یعنی پروگرام کے مطابق کنونشن کو اتوار کی دوپہر کے بعد ختم ہو جانا تھا لیکن انہوں نے اعلان کیا کہ اب کنونشن اتوار کی شب تک جاری رہے گی اور وہ اپنا خطاب اتوار کی شام ۵ بجے کے اجلاس میں پیش کریں گے۔ یہ خوشخبری تمام احباب کے دلوں میں تازگی اور افسردگی آرزوؤں میں تبدیل ہو گئی۔ اس طرح بزموں کا یہ اجلاس نئے عزم اور نئے حوصلوں کو اپنے جلو میں لئے اختتام پذیر ہوا۔

بارش کی وجہ سے اگرچہ کھلے اجلاس کے پروگرام میں معمولی سی تبدیلی کرنا پڑی لیکن دیگر تمام انتظامات اور مصروفیات بدستور جاری رہیں۔ مطبخ کے اوقات میں بھی کوئی فرق نہیں آیا اور کھانا بروقت تیار ہوتا رہا۔ کھانے کے چند ساعتوں بعد بزم مذاکرہ شروع ہونے والی تھی۔ پنڈال میں حاضرین کی تعداد لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔

۲۵ نومبر
ہفتہ

چوتھا کھلا اجلاس

دوپہر
۲ بجے

بزمِ مذاکرہ

صدارت:۔ محترم شیخ سراج الحق صاحب — تلاوت:۔ محترمہ ثریا عندلیب صاحبہ

سٹیج سیکرٹری:۔ مفکر قرآن محترم پرویز صاحب — کلامِ اقبال:۔ محترم مرزا محمد خلیل صاحب

اس اجلاس کی ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ اس کے سٹیج سیکرٹری کے فرائض خود مفکر قرآن سرانجام دیتے ہیں۔ یہ اسلئے کہ مذاکرہ میں ہماری نئی نسل کے نونہالان، بچے اور بچیاں شرکت کرتے ہیں اور جیسا کہ پرویز صاحب

اکثر، اور مذاکرہ کی تقریب پر ہمیشہ، کہا کرتے ہیں، وہ اپنے پیغام کا اولین مخاطب انہی کو سمجھتے ہیں جن میں سے ہر ایک ملت کے مقدر کا ستارہ ہوتا ہے اور جن سے آگے چل کر محمود قوم ترتیب پاتی ہے۔ یہ بچے اور بچیاں جب اپنے "شفیق بابا جی" کو اپنے سامنے دیکھتے ہیں تو یوں اسٹیج کی طرف شاداں و فرحاں اور کشاں کشاں چلے آتے ہیں، جیسے کوئی بچہ اپنے باپ کی انگلی پکڑے عید گاہ کی طرف جا رہا ہو۔ ان کے "بابا جی" نہ صرف یہ کہ نہایت محبت اور پیار سے انہیں سامعین کے سامنے لاتے ہیں بلکہ جس دل کشا اور مسرت آگیں انداز سے ان کا تعارف کراتے اور جس حوصلہ افزا اسلوب سے ان کے مقالات پر تبصرہ کرتے ہیں۔ اس سے ان بچوں کے سینے میں تازہ ولولے بیدار ہو جاتے ہیں، اور وہ آئندہ سال بزمِ مذاکرہ میں شرکت کا عزم بلند لئے واپس جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کنونشن کی یہ بزم بڑی جاذب اور دلکش ہوتی جا رہی ہے۔ اور بچوں اور نوجوانوں کے مقالات کا معیار بلند سے بلند تر۔ کس قدر نتیجہ خیز ہے نئی پود کی تعلیم و تربیت کا یہ طریق جس کی ہمارے اس مفکرِ قرآن نے اس قابلِ رشک انداز سے طرح ڈالی ہے!

سابقہ کنونشن (منعقدہ اپریل ۱۹۷۲ء) میں مذاکرہ کا موضوع تھا — "آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا"۔ اور موجودہ عنوان تھا — ؎

ہو فکر اگر خام تو آزادیِ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

اس اجلاس کی صدارت، پرویز صاحب کے قدیم ترین رفیق، اور بقول پرویز صاحب "خود ان سے بھی زیادہ بزرگ" محترم شیخ سراج الحق صاحب نے فرمائی۔ اس مجلس میں تلاوتِ قرآن کریم کی سعادت بزمِ خواتین کی نمائندہ محترمہ بہن ثریا عندلیب صاحبہ کے حصے میں آئی۔ انہوں نے تلاوت کے بعد متعلقہ آیات کے مفہوم کو بھی پیش کیا جو بڑا ہی بلیغ اور عمیق تھا۔ اس کے بعد مذاکرہ کی روایت کے مطابق شرکائے مذاکرہ میں سے سب سے چھوٹی بچی عزیزہ سنبل لطیف نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اُسے گِلہ تھا کہ قافلۂ قرآنی کے احباب اپنی پختہ فکری کے باوجود اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو ہمراہ کیوں نہیں لاتے۔ اس کے بعد جھنگ صدر سے طاہرہ بیٹی عزیزہ تبسم سلطانہ نے اپنے احساسات کا اظہار کیا۔ وہ نویں جماعت کی طالبہ ہیں۔ ان کے بعد شرکائے مذاکرہ کے اسمائے گرامی حسبِ ترتیب شمولیت، حسبِ ذیل ہیں:

شہباز مرزا (طالب علم بی۔ ایس سی۔ گورنمنٹ کالج لاہور)، ثریا عندلیب، عبدالقیوم انجم۔ (طالب علم ایم۔ اے انگلش۔ ایم۔ اے۔ او۔ کالج لاہور) محمد نذیر خٹک (ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ مردان)، محیہ فاروقی (طالبہ بی۔ اے)، گوگی (پانچویں جماعت)، گوگی کی بہن۔ رانی (دوسری جماعت)، شاہد امین حمید (طالب علم بی۔ ایس سی)، مقبول الٰہی (سینئر انگلش ٹیچر۔ اسلامیہ ہائی سکول مغلپورہ لاہور)، شہزاد قیصر (ایم۔ اے فلسفہ گولڈ میڈلسٹ)، خالد سلام (پروفیسر۔ انجینئرنگ یونیورسٹی۔ لاہور) غلام صابر۔ (ایم۔ اے۔ اردو، فارسی)، عارفی سلطانہ (ایم۔ اے فلسفہ، اردو۔) سہیلہ پرویز۔ (ایم۔ اے۔)

(یہ مقالات چونکہ طلوعِ اسلام میں شائع ہوں گے، اسلئے ان کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔)

مذاکرہ کی یہ نشست نماز مغرب کے وقفے کے بعد دوبارہ شروع ہوئی اور رات ۸½ بجے تک جاری رہا۔ پنڈال میں روشنی کا انتظام محترم رفضل عابد صاحب نے اس قدر خوبصورتی سے کیا تھا کہ مذاکرہ کی نشست جگمگاہٹ کے اعتبار سے بھی نہایت کامیاب رہی۔ اس کے بعد پرویز صاحب کی "سوال وجواب" کی محفل شروع ہونے والی تھی یعنی "مجلس استفسارات"۔

احباب نے کھانا کھایا اور پنڈال میں واپس آکر اپنی اپنی نشستوں کو سنبھال لیا۔ پنڈال اجلاس شروع ہونے سے پہلے ہی بھر چکا تھا۔

۲۵ر نومبر — رات
ہفتہ — نو بجے

پانچواں کھلا اجلاس

مجلس استفسارات

بارش کی وجہ سے سردی بڑھ گئی تھی۔ اور لوگ اپنی اپنی جگہوں پر پرویز صاحب کی اس نہایت فکر پرور خیال افروز اور شگفتہ محفل میں ہمہ تن گوش بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ محفل ایک گھریلو قسم کی گفتگو کا تاثر لئے ہوئے ہوتی ہے جس میں پرویز صاحب زندگی کے اہم عملی مسائل سے متعلق استفسارات کا قرآن کی روشنی میں نہایت پُراثر اور اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں جواب دیتے ہیں۔ وہ مشکل سے مشکل مسائل کو اتنی بشاشت اور لطافت سے حل کر دیتے ہیں جو سیدھا دل تک اُتر جاتا ہے اور کبھی حافظہ سے محو نہیں ہوتا۔ اس نشست کی تفصیلات کو تحریر میں لانا ناممکن نہیں مشکل ضرور ہے۔ اس کے متعلق ہر سال یہی کہنا پڑتا ہے کہ

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

اس کی تفصیل پڑھنے سے وہ کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی جو اس میں شرکت سے پیدا ہوتی ہے۔ رات کے ۱۲ بجے یعنی پورے تین گھنٹے تک یہ نشست جاری رہی۔ سردی کے باوجود سامعین رات گئے تک مزید بیٹھنے کے لئے تیار ہی نہیں مُصر تھے۔ لیکن صبح اتوار کو بھی کھلا اجلاس تھا۔ اسلئے یہ نشست نہایت شگفتہ کیفیات کو لئے ہوئے ختم ہوئی اور ذہنوں سے شکوک وشبہات کی خلشیں صاف کر گئی۔

۲۶ر نومبر — صبح
اتوار — ۹½ بجے

چھٹا کھلا اجلاس

صدارت :- محترم ڈاکٹر صلاح الدین اکبر صاحب ، تلاوت :- عزیزہ تبسم سلطانہ
سٹیج سیکرٹری :- محترم پروفیسر خالد سلام صاحب ، کلام اقبال :- محترم مرزا محمد خلیل صاحب
خطاب :- محترم پرویز صاحب

اس محفل میں بزم طلوع اسلام کراچی کے نمائندہ اور تحریک کے مایہ ناز کارکن محترم محمد اسلام صاحب نے اپنا مقالہ پیش کیا (جو اسی اشاعت میں سامنے آ رہا ہے) اور اس کے بعد پرویز صاحب نے وقت کے اہم ترین سوال کا بصیرت افروز اور سکون بخش جواب دیا۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا ــــ "کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟" اس میں شبہ نہیں کہ اس سوال کا جواب دینے کے لئے قرآن کی بارگاہ ہی سے اطمینان بخش جواب مل سکتا ہے جسے پرویز صاحب نے بنہایت شرح وبسط سے پیش کیا۔ (یہ مقالہ طلوع اسلام میں شائع ہو گا۔ اس لئے اس کی تفصیل نہیں دی گئی۔

---

۲۶ نومبر ۱۹۷۲ء　　　　　　　　　　　　شام ۵ بجے
اتوار　　　　　　　　　　　　　　　　(بعد از نماز مغرب)

ساتواں کھلا اجلاس

صدارت :- محترم ظفر حسن محمود صاحب　؛　تلاوت :- محترم حافظ عبدالمجید صاحب
سٹیج سیکرٹری :- محترم پروفیسر خالد اسلام صاحب　؛　کلام اقبال :- محترم مرزا محمد خلیل صاحب
خطاب :- محترم پرویز صاحب

خطاب کا عنوان "۔۔۔۔" ــــ "ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ" ــــ انہوں نے یہ خطاب جمعہ کی شام کو پیش کرنا تھا۔ لیکن بارش کی وجہ سے اُسے ملتوی کرنا پڑا۔ اور اسی کی خاطر خود کنونشن کو بھی اتوار کی شام تک وسعت دینی پڑی۔ اس خطاب میں انہوں نے دین کی بنیادی اصطلاحات کے مروجہ مفہوم اور غلط معانی کا ذکر کیا اور پھر قرآن کریم کی روشنی میں ان کا مفہوم متعین کیا۔ یہ خطاب موجودہ حالات کے نظر و فکر کے ابہام میں نہ صرف ایک نہایت علمی ضرورت کو پورا کرتا ہے بلکہ ہمارے مستقبل کو بھی درخشندہ بنانے کا موجب ہو سکتا ہے۔ ہمارا اجتماعی مرض یہ ہے کہ ہمارے سامنے وہ صحیح قرآنی مفہوم نہیں جو ملت کے بکھرے ہوئے خیالات کو یکجا کر سکے اور قوم متحد ہو سکے۔ (یہ خطاب اشاعت حاضرہ میں زیب دہ اوراق طلوع اسلام ہے)۔ یہ حسین و جمیل اجلاس رات ۸ بجے ختم ہوا۔

افسوس ــــ اس کے ساتھ ہی طلوع اسلام کا پندرہواں سالانہ کنونشن ختم ہو گیا جس کے تمام اجتماعات کا ماحصل یہ تھا (اس میں چاہے مذاکرہ کی نشست ہو یا محترم پرویز صاحب کے خطابات یا بزموں کے اجلاس) کہ ہمارے موجودہ خلفشار اور اضطراب کا واحد علاج یہ ہے کہ ہم فکری طور پر قرآن کریم کو راہنما بنائیں' ورنہ ذلت و گمرہی اس قوم کی تقدیر بن جائے گی۔

زمانے کی اس شب دیجور میں طلوع اسلام کی روشن کردہ شمع قرآنی کس قدر مغتنمات میں سے ہے۔ خدا اس شمع کو درخشندہ سے درخشندہ تر کرے ــــ ان دعاؤں اور آرزوؤں کے ساتھ مندوبین کو دوسری صبح پرویز صاحب و ۔۔۔ بزم لاہور نے گلے مل کر رخصت کیا۔

وہ الوداع کا منظر' وہ بھیگتی پلکیں ⁂ بس غبار میں کیا کیا دکھائی دیتا ہے

باسمہٖ تعالیٰ

قوموں کی حیات ان کے تخیل پہ ہے موقوف

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

(مذہب اور سیاست کی وہ بنیادی اصطلاحات جنہیں ہم روزمرّہ استعمال کرتے ہیں لیکن جن کا کوئی متعین مفہوم ہمارے ذہن میں نہیں ہوتا)

طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ نومبر ۱۹۷۲ء میں

پرویز صاحب کا خطاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

صدرِ محترم و عزیزانِ گرامی قدر۔ سلام و رحمت

جیسا کہ آپ نے پروگرام سے دیکھ لیا ہوگا، میرے آج کے خطاب کا عنوان ہے:

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ

میں سمجھتا ہوں کہ آپ میں سے اکثر احباب کو یہ عنوان کچھ عجیب سا دکھائی دے گا۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ عجیب ہوں گے وہ حقائق جو اس عنوان کے تابع آپ کے سامنے آئیں گے اور اس کے بعد جب ان عجائبات پر پڑے ہوئے پردے اٹھیں گے، تو عجیب تر حقیقتیں بے نقاب ہوں گی۔ ہم صبح سے شام تک سینکڑوں الفاظ بلا تکلف بولتے اور بیسیوں اصطلاحات بلا تامل استعمال کرتے ہیں لیکن اگر ہم کبھی سوچنے بیٹھیں تو یہ عجیب حقیقت ہمارے سامنے آئے گی کہ ان میں سے بیشتر کا کوئی متعین مفہوم ہمارے ذہن میں نہیں ہوتا۔ اگر ان الفاظ و اصطلاحات کا دائرہ ہماری روزمرہ کی نجی زندگی تک محدود ہو تو اس سے کچھ زیادہ حرج واقع نہیں ہوتا لیکن جب ان کا تعلق زندگی کے اجتماعی مسائل سے ہو تو اس کے نتائج بڑے دُور رس اور عواقب بڑے مضرت رساں ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ ذرا اس حقیقت پر غور فرمائیے کہ آج دنیا میں قریب ستر کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ ہم ساری دنیا کو سامنے نہ بھی رکھیں تو بھی صرف اس خطۂ پاکستان میں قریب چھ کروڑ مسلمان رہتے ہیں۔ ان میں سے ہر شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے لیکن اگر آپ ان میں سے کسی سے پوچھیں کہ مسلمان کہتے کسے ہیں تو اوّل تو وہ کوئی متعین جواب دے نہیں سکے گا، اور اگر کوئی جواب دے گا، تو ایک کا جواب دوسرے سے نہیں ملے گا۔

یہ عوام تک ہی محدود نہیں۔ اس میں، ہمارے مذہب کے اجارہ دار، علمائے کرام بھی برابر کے شریک ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب سنہ ۱۹۵۳ء کے فسادات پنجاب کے سلسلہ میں تحقیقات کے لئے منیر کمیٹی قائم ہوئی تھی، تو انہوں نے ملک کے بلند پایہ علماء سے یہی سوال پوچھا تھا کہ مسلمان کسے کہتے ہیں۔ اس کے جواب میں اکثر و بیشتر نے تو اتنا کہہ کر پیچھا چھڑا لیا کہ یہ سوال ایسا نہیں جس کا جواب ارتجالاً دیا جا سکے۔ اس کے لئے خاصا توقّف چاہیئے، اور جن حضرات نے جواب دیا ان میں سے کسی ایک کا جواب، دوسرے سے نہیں ملتا تھا۔ اس کے بعد ان علماء کی طرف سے یہ مطالبہ تو مسلسل ہوتا رہا کہ آئین میں یہ شق درج ہونی چاہیئے کہ مملکت کے صدر کے لئے مسلمان ہونا ضروری ہے لیکن مسلمان کی تعریف (DEFINITION) متعین کرنے سے ہر ایک گریز کرتا رہا۔ اس سال، مرکزی اسمبلی کے ایوان میں پھر یہ سوال اٹھایا گیا تو اس کا جواب، سارے ملک کے علمائے کرام میں سے صرف ایک۔ (شاہ احمد نورانی۔ رکن مرکزی اسمبلی) نے دیا، اور جو جواب

انہوں نے دیا، اس کی مخالفت چاروں طرف سے ہونی شروع ہو گئی۔ ممکن ہے آپ کہہ دیں کہ اس سوال کا جواب آسان ہے یعنی مسلمان اسے کہتے ہیں جو اسلام کا ماننے والا ہو۔ لیکن جب آپ سے پوچھا جائے کہ اسلام کسے کہتے ہیں تو آپ کے ذہن کی گاڑی پھر رک جائے گی۔ اس کا آپ کے پاس کوئی متعین جواب نہیں ہوگا کہ اسلام کسے کہتے ہیں۔ اس سے آپ عزیزان من! اندازہ لگا لیجئے کہ یہ امر کس قدر باعثِ تعجب اور وجہِ حیرت ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان متفقہ طور پر یہ بھی نہ بتا سکیں کہ اسلام کسے کہتے ہیں اور مسلمان کی تعریف کیا ہے؟ اور یہیں سے یہ حقیقت بھی سمجھ میں آجائے گی کہ مسلمانوں کی اس منتشر کروڑ آبادی میں جو اس قدر تشتت و افتراق، اس قدر انتشار و خلفشار، اس قدر منازعات و اختلافات، اس قدر فقدانِ وحدت و عدمِ اتحاد ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں فکری وحدت نہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

ہم میں سے عوام نے (کہ جنہیں آپ جمہور مسلمان یا امت کا گروہ عظیم و کثیر کہہ لیجئے) تو کبھی سوچا ہی نہیں کہ جب ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں تو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ لیکن جنہیں خواص (یا طبقۂ علماء) کہا جاتا ہے، انہوں نے بھی سوچا ہے تو ان کی سوچ ان کے اپنے فرقے کے "چار دیواری" میں محصور ہو کر رہ گئی ہے۔ یعنی وہ حضرات اتنا تو شاید بتا سکیں کہ شیعہ کسے کہتے ہیں اور سنی کسے۔ پھر سنیوں میں، اہلِ حدیث کسے کہتے ہیں اور اہلِ فقہ کسے۔ پھر اہلِ فقہ میں سے، حنفی کسے کہتے ہیں اور شافعی کسے۔ مالکی کسے کہتے ہیں اور حنبلی کسے۔ دیوبندی کسے کہتے ہیں اور بریلوی کسے۔ لیکن ان میں سے متعین طور پر کوئی نہیں بتا سکے گا کہ مسلمان کسے کہتے ہیں اور اسلام کیا ہے؟

پروفیسر وائٹ ہیڈ نے کہا ہے کہ اگر کسی پرابلم کو (DEFINE) کر دیا جائے تو اس سے آدھا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ اس بنا پر میں یہ عرض کروں گا کہ اگر آج کوئی صاحبِ فکر، اس امتِ منتشرہ میں وحدت پیدا کرنے کیلئے اٹھے تو اس کے لئے سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہوگا کہ وہ اس اسلام کے بنیادی تصورات کا مفہوم متعین کرے جس کی طرف یہ امت اپنے آپ کو (لفظاً ہی سہی) منسوب کرتی ہے۔ اس کے سوا، مسلمانوں میں وحدت تو ایک طرف اتحاد پیدا کرنے کی بھی کوئی صورت ممکن نہیں۔ وحدتِ فکر وہ بنیاد ہے جس پر وحدتِ عمل کی عمارت استوار ہوتی ہے اور اسی وحدتِ فکر و عمل کا نام امت کی وحدت ہے۔ میں، برادرانِ گرامی قدر! قرآن کریم کا طالب علم ہوں۔ میں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ اس کتاب عظیم کی روشنی میں، اپنی بصیرت کے مطابق، اسلام کے بنیادی تصورات کا مفہوم متعین کرنے میں صرف کیا ہے اور میری اس کوشش کا ماحصل میری تصانیف کے اوراق میں محفوظ ہے۔ بالخصوص لغات القرآن میں۔ میں آج کی نشست میں آپ احباب کے سامنے، ان میں سے چند ایک اہم تصورات کا مفہوم پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرا تعلق نہ کسی مذہبی فرقہ سے ہے نہ کسی سیاسی جماعت سے۔ اس لئے میرے پیش کردہ مفاہیم کی بنیاد قرآن کریم ہے نہ کہ کسی خاص فرقے کے معتقدات۔ اگر آپ احباب ان مفاہیم سے متفق ہوں تو ہو المراد۔ لیکن اگر آپ کو ان سے اختلاف ہو، تو میں کسی کو مجبور نہیں کروں گا کہ وہ انہیں ضرور صحیح تسلیم کرے۔ لیکن اتنا پھر بھی کہوں گا کہ جب تک دین کے بنیادی تصورات کا متفق علیہ مفہوم متعین نہیں ہوتا، امت میں وحدت پیدا نہیں ہو سکتی۔ امتوں کی وحدت، ان کے افراد کے قلب و نظر کی ہم آہنگی سے پیدا ہوتی ہے۔ علامہ اقبال

کے الفاظ میں

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ؟
با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ

اور یہ "با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ" اسی صورت میں ممکن ہے جب تمام افراد امت کے سامنے دین کے تصورات متفق علیہ متعین متبیّن ہوں۔

ان تمہیدی گزارشات کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔

۱۔ اسلام

سب سے پہلے ہم اسلام کو لیتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے کہ کائنات کی ہر شے اس قانون کے سامنے تسلیم خم کئے ہوئے ہے جو اس کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ لَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۳/۸۳)۔ اسی لفظ اَسْلَمَ سے اسلام ہے یعنی کسی کے سامنے جھکنا۔ سر تسلیم خم کرنا۔ دوسری جگہ اسے لفظ سجدہ سے تعبیر کیا گیا ہے جہاں کہا ہے کہ وَ لِلّٰهِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۱۳/۱۵)۔ کائنات میں جو کچھ ہے قوانین خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ اشیائے کائنات کا اس طرح قوانین خداوندی کی اطاعت کرنا ان کے اختیار و ارادے سے نہیں۔ انہیں اختیار و ارادہ دیا ہی نہیں گیا۔ وہ انکی اطاعت کے لئے مجبور ہیں۔ انہیں ان قوانین کے خلاف مجال سرکشی نہیں۔ یارائے سرتابی نہیں۔ سورۂ نحل میں ہے وَ لِلّٰهِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ ○ (۱۶/۴۹)۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے ——— وہ جاندار ہوں یا مظاہر فطرت ——— سب قوانین خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہیں اور ان سے کبھی سرکشی نہیں برتتے۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (۱۶/۵۰)۔ جو کچھ ان سے کہا جاتا ہے وہ اس کی تعمیل کئے جاتے ہیں۔ ان کی اس روشِ زندگی کو اسلام کہا گیا ہے۔ یعنی قوانین خداوندی کی اطاعت۔ یکسر اطاعت۔ علی وجہ الکمال اطاعت۔

۲۔ الاسلام

اشیائے کائنات کی تو یہ کیفیت ہے کہ وہ سب کی سب، ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کئے جا رہی ہیں جو ان کے لئے تجویز کئے گئے ہیں کیونکہ وہ ایسا کرنے پر مجبور ہیں، لیکن انسان کو صاحب اختیار پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کا جی چاہے تو ان قوانین کی اطاعت اختیار کرے، اور جی چاہے ان کی خلاف ورزی کرے۔ ان قوانین کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق انسان کی طبیعی زندگی سے ہے۔ یہ وہی قوانین ہیں جن کا اطلاق دیگر حیوانات پر بھی ہوتا ہے۔ اگر انسان ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے تو اس سے اتنا ہی ہوتا ہے کہ وہ تندرست و توانا رہتا ہے۔ اس کے طبیعی جسم کی کیفیت خوشگوار ہوتی ہے لیکن اس میں شرفِ انسانیت کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ یہ قوانینِ فطرت کے دوسرے قوانین کی طرح، علوم سائنس کے ذریعے دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے جتنے قوانین معلوم ہو چکے ہیں وہ تو صدیوں سے واقف شدہ چلے آ رہے ہیں۔ باقی ایسے ہیں جن میں نئے نئے سائنٹیفک انکشافات

ہوتے رہتے ہیں۔

دوسری قسم کے قوانین وہ ہیں جن کا تعلق انسان کی ذات کی نشوونما، اور اس کی تمدنی زندگی کے نظم و ضبط سے ہے۔ یہ قوانین اُسے وحی کے ذریعے ملتے ہیں اور اب قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ انسان کا ان قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا' الاسلام کہلاتا ہے۔ طبیعی زندگی سے متعلق قوانین کی اطاعت تو انفرادی طور پر کی جا سکتی ہے اور کی جاتی ہے' لیکن ان قوانین کا اتباع ایک نظام کے تابع ہی ممکن ہے۔ نظام کے لئے قرآن کریم میں دین کا لفظ آیا ہے۔ یہ لفظ' ہر نظامِ حیات کے لئے بولا جا سکتا ہے' لیکن جب الاسلام کو نظامِ حیات کے طور پر اختیار کیا جائے تو اس وقت یہ لفظ (INDEFINITE) سے (DEFINITE) ہو جائے گا اور الدین کہلائے گا' اسی لئے قرآن میں ہے اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (۳/۱۹)۔ اَلدِّین' اللہ کے نزدیک' الاسلام ہی ہے۔ دوسری جگہ اس کی وضاحت ان الفاظ سے کر دی کہ وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ وَ ھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ○ (۳/۸۵) جو شخص الاسلام کے علاوہ کوئی اور دین (نظامِ حیات) تلاش اور اختیار کرے گا' تو میزانِ خداوندی میں وہ قابلِ قبول نہیں ہوگا' اور وہ دیکھ لے گا کہ آخر الامر وہ کس قدر خسارے میں رہتا ہے۔

۳ - اَلدِّین

میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ الاسلام پر انفرادی طور پر عمل پیرا نہیں ہوا جا سکتا' اجتماعی طور پر ہی ہوا جا سکتا ہے۔ یعنی ایک نظامِ حیات کے تابع ہے جسے الدین کہہ کر پکارا گیا ہے۔ دورِ حاضر کی اصطلاح میں اسے نظامِ مملکت کہا جاتا ہے۔ قرآن میں قوانینِ حکومت یا نظامِ مملکت کے لئے' یہی لفظ آیا ہے۔ مثلاً سورۂ یوسف میں ہے کہ حضرت یوسفؑ اپنے بھائی (بن یامین) کو اپنے پاس روک لینا چاہتے تھے لیکن مَا کَانَ لِیَاْخُذَ اَخَاہُ فِیْ دِیْنِ الْمَلِکِ (۱۲/۷۶) - وہ' وہاں کے بادشاہ کے قانونِ حکومت کی رو سے ایسا کر نہیں سکتے تھے۔ یہاں دین کا لفظ قانونِ حکومت کے لئے آیا ہے۔ سورۃ النور میں زانی اور زانیہ کی سزا کا حکم آیا ہے جس کے ساتھ کہا گیا ہے کہ یہ سزا جماعتِ مومنین کے سامنے دی جائے۔ وَّ لَا تَاْخُذْکُمْ بِہِمَا رَاْفَۃٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ (۲۴/۲)۔ اور تم دین اللہ کے معاملہ میں قطعاً نرمی نہ برتو۔ یہاں ضابطۂ تعزیرات کے لئے دین اللہ کی اصطلاح آئی ہے۔ یہی دین اللہ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ۔ یاد رکھو! حکومت کا حق خدا کو حاصل ہے۔ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی اطاعت اور محکومیت اختیار نہ کی جائے۔ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (۱۲/۴۰)۔ یہی نظامِ مملکت سب سے محکم ہے۔ اس نظامِ خداوندی (دینِ الٰہی) کے تمکن اور استحکام کے لئے' اپنی مملکت کا وجود لاینفک ہے۔ سورۃ النور میں ہے وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّہُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِہِمْ۔ تم میں سے جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھیں اور ان کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں' خدا نے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ انہیں اسی طرح مملکت میں حکومت عطا کر دے گا جس طرح

اسی قسم کی قوموں کو ان سے پہلے حکومت عطا ہوتی رہی ہے۔ اس حکومت کا مقصد کیا ہوگا؟ فرمایا۔ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ (۲۴/۵۵)۔ اس کا مقصد یہ ہوگا کہ اس سے اس دین کو تمکن حاصل ہو جائے جسے خدا نے ان کے لئے پسند کیا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ اپنی آزاد مملکت کے بغیر الاسلام پر عمل پیرا ہونا ناممکن ہے۔

۴- مذہب

جب اپنی مملکت نہ ہو، یا مملکت تو ہو لیکن اس میں الاسلام کو بطور نظامِ حیات اختیار نہ کیا گیا ہو، تو اس صورت میں اسلام، دین نہیں رہتا۔ (عام اصطلاح میں) مذہب بن جاتا ہے۔ مذہب کا لفظ قرآن کریم میں نہیں آیا اس لئے کہ الاسلام میں مذہب کا تصور ہی نہیں۔ مذہب میں اسلام یا دین سے مفہوم لیا جاتا ہے خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق جسے پوجا پاٹ، پرستش بندگی، یا دیگر رسوم و مناسک کی ادائیگی کے ذریعے قائم کیا جاتا ہے۔ اس وابستگی کا تعلق محض عقیدے سے ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ اس کی حقیقت کچھ نہیں ہو سکتی۔ مذہبی پیشوائیت، دین کے اس پیکرِ بے روح اور جسدِ بے جان کو قائم رکھتی ہے کیونکہ اس سے ان کے مفاد وابستہ ہوتے ہیں۔ یہ فریبِ تخیل ہوتا ہے جو حقائق کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ یہ دین کی ممی شدہ لاش ہوتی ہے جسے مردہ پرست ذہنیتیں تقدس کے تابوت میں محفوظ رکھتی ہیں۔ مذہب کے لئے چونکہ اپنی مملکت کی ضرورت نہیں ہوتی، اس لئے یہ ہر مملکت اور ہر حکومت میں پنپتا رہتا ہے اور حکومتیں (بالعموم) اس کی آزادی دے دیتی ہیں۔ ہمیں انگریز کی حکومت میں بھی مذہبی آزادی حاصل تھی اور اب ہندوستان میں بھی مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ لیکن کوئی حکومت دین کی آزادی نہیں دیتی کیونکہ دین تو اپنی آزاد مملکت قائم کرتا ہے۔ چونکہ مسلمانوں کی نگاہوں سے دین کا تصور صدیوں سے اوجھل ہو چکا ہے اس لئے یہ بھی دیگر اہلِ مذاہب کے تتبع میں اسلام کو مذہب کہہ کر پکارتے ہیں اور انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ (RELIGION) کرتے ہیں۔ اسلام، بہ حیثیت الدّین کے اس وقت دنیا میں کہیں بھی نہیں۔ ہر جگہ (خواہ وہ مسلمانوں کی اپنی سلطنتیں ہوں یا مسلمان غیر مسلموں کے زیرِ حکومت رہتے ہوں) یہ مذہب کی شکل ہی میں موجود ہے۔

۵- مسلمان

اب ہم اس لفظ کی طرف آتے ہیں جو (جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے) استعمال کے لحاظ سے دنیا کے ہر گوشے میں، بیک وقت، کروڑوں زبانوں پر ہوتا ہے۔ لیکن مفہوم کے اعتبار سے جس کی یہ کیفیت ہے کہ کوئی دو ذہن بھی اس کی متفق علیہ (DEFINITION) متعین نہیں کر سکتے۔ وہ لفظ ہے مسلمان۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اس شکل میں نہیں آیا۔ اس کی جگہ اس میں مسلم کا لفظ آیا ہے جس کی جمع مسلمون اور مسلمین آتی ہے۔ معنوی لحاظ سے مسلم سے مراد ہوگی قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والا۔ یعنی الاسلام کا پیرو۔ لیکن اس کا یہ مفہوم تو الدّین کی رُو سے ہوگا جس میں اسلام کو بطور نظامِ حیات اختیار کیا جائے گا۔ مذہب میں چونکہ خود اسلام کا مفہوم ہی متعین نہیں، اس لئے مسلمان کا مفہوم کس طرح متعین ہو سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام

مسلمان کی کوئی متفق علیہ تعریف نہیں پیش کر سکتے۔ یہ علماء خود مذہبی پیشوا ہیں۔ دین سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ دین میں مذہبی پیشوائیت کا وجود ہی نہیں ہوتا۔

۲۔ ایمان

قرآن کریم کی ایک اہم بنیادی اصطلاح ایمان ہے۔ مذہب میں پہنچ کر ایمان کے معنی (FAITH) کے ہو جاتے ہیں جس سے مراد ہوتی ہے مذہبی مسلّمات کو بلا دلیل و برہان اور بغیر علم و بصیرت، آنکھیں بند کر کے ماننا۔ لیکن دین میں اس کا مطلب ہوتا ہے وحی کی عطا کردہ اقدار و اصول و احکام کو علیٰ وجہ البصیرت، دل اور دماغ کے کامل اطمینان اور سکون کے ساتھ حقیقت تسلیم کرنا۔ غور و فکر اور دلیل و برہان کے بغیر کسی بات کے تسلیم کر لینے کو قرآن، ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا۔ چنانچہ قرآن کریم میں مومنین کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (۲۵/۷۳)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ (اور تو اور) جب ان کے سامنے آیات خداوندی بھی پیش کی جاتی ہیں تو یہ انہیں بھی اندھے بہرے بن کر تسلیم نہیں کرتے۔ قرآن کریم اپنے ہر دعوے کو دلائل و براہین کی رو سے پیش کرتا ہے اور اپنے مخالفین سے بھی یہی مطالبہ کرتا ہے کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲/۱۱۱)۔ اس کی تائید میں دلیل و برہان پیش کرو۔ ایمان کے متعلق اس قرآنی صراحت سے واضح ہے کہ،

(۱) کوئی شخص جبر و اکراہ سے مومن نہیں بن سکتا۔ خواہ جبر و اکراہ کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

(۲) کوئی شخص تقلیداً مومن نہیں ہو سکتا کیونکہ تقلید میں کسی مسلک کو علم و بصیرت کی رو سے اختیار نہیں کیا جاتا، اور

(۳) نہ ہی کوئی شخص پیدائشی طور پر مومن ہو سکتا ہے۔

لیکن علم و بصیرت کی رو سے ابدی صداقتوں کو تسلیم کر لینا بھی مقصود بالذات نہیں۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ انسان، ان صداقتوں کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے ساتھ ہر جگہ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کی شرط عائد کی ہے۔ یعنی ایمان کے بعد اس کے مطابق عمل کرنے سے مقصد حاصل ہو سکتا ہے، خالی ایمان سے نہیں۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو مسلم ہونا، ہر مومن کی لازمی خصوصیت ہے۔ یعنی ہر مومن کو مسلم (یعنی قوانین خداوندی کے سامنے جھکا ہوا) ہونا چاہیئے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے، قرآن کریم نے مسلم اور مومن کے الفاظ مترادف المعنی بھی استعمال کئے ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے ایک اور بات بھی کہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کو، دین کی صداقتوں کے متعلق، قلب و دماغ کا اطمینان تو ہنوز حاصل نہ ہوا ہو لیکن وہ اسلامی نظام کو کسی اور وجہ سے اختیار کرلے ______ اور وجہ سے مراد جبر و اکراہ نہیں ______ مثلاً جب مدینہ میں اسلامی حکومت قائم ہوئی اور اس کے انقلاب آفریں نتائج ظہور میں آنے لگے، تو یہ چیز، گرد و نواح کے بدوی قبائل کے لئے وجہ کشش بن گئی اور اس طرح وہ بھی اسلامی نظام مملکت میں داخل ہو گئے۔ اس میں داخل ہونے کے بعد انہوں نے بزعم خویش

سمجھ لیا کہ وہ مومن ہو گئے ہیں لیکن قرآن کریم نے انہیں اس پر متنبہ کیا اور کہا کہ تمہاری کیفیت ہنوز مومنین کی سی نہیں ہے۔ سورۂ حجرات میں ہے۔ قَالَتِ الْأَعْرَابُ اٰمَنَّا۔ یہ بدو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لاتے ہیں۔ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا۔ ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لاتے وَ لٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا۔ انہیں یہ کہنا چاہیئے کہ ہم نے اس نظام کو تسلیم کر لیا ہے۔ ہم اس کے سامنے جھک گئے ہیں۔ وَ لَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ ایمان تمہارے دلوں کے اندر داخل نہیں ہوا۔ ہاں ہم انہیں اطمینان دلاؤ کہ وَ اِنْ تُطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَا یَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَیْـًٔا (۴۹/۱۴)۔ اگر تم نے خدا اور رسول (اسلامی نظام) کی اطاعت کی تو تمہارے اعمال میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائے گی۔ لفظ اَسْلَمْنَا کے اعتبار سے ان لوگوں کو (ہماری اصطلاح میں) مسلمان کہا جائے گا۔ یعنی مومن تو وہ ہیں کہ ایمان جن کے قلب کی گہرائیوں میں اتر چکا ہو۔ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ (۵۸/۲۲)۔ ایمان جن کے دلوں میں منقوش ہو چکا ہو۔ اور مسلمان وہ ہیں جن کے ایمان کی یہ کیفیت تو نہیں لیکن انہوں نے اسلام کو بحیثیت نظام زندگی اختیار کر لیا ہے۔ یاد رہے کہ ان لوگوں سے بھی اسلامی نظام بزور شمشیر نہیں منوایا گیا تھا۔ اسے انہوں نے بطیب خاطر اختیار کیا تھا۔ نہ ہی قرآن نے ان لوگوں کو منافق کہا ہے۔ منافق وہ ہوتا ہے جو دل سے اس نظام کا مخالف ہو لیکن کسی مصلحت کے ماتحت زبان سے اس مخالفت کا اقرار نہ کرے اور فریب دہی کے طور پر مسلمانوں کے زمرہ میں شامل ہو جائے۔

جہاں تک ہم (موجودہ) مسلمانوں کا تعلق ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کا شمار کس شق (CATEGORY) میں کیا جائے۔ مومن تو ہم ہیں نہیں کیونکہ بہ حیثیت مجموعی ہم نے اسلام کو علیٰ وجہ البصیرت اختیار نہیں کیا۔ نہ ہی ہم زمانہ نزول قرآن کے اعراب (بدوؤں) کی طرح کے مسلمان ہیں کہ ہم نے اسلامی نظام کی کشش و جاذبیت کی بنا پر اپنے آپ کو اس کی سپردگی میں نہیں دیا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، ایمان لانے یا مسلمان ہونے کے لئے کچھ کرنا پڑتا ہے لیکن ہم کچھ کئے بغیر ہی اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ ہمارا مسلمان ہونا اس سے زیادہ کیا ہے کہ ہم ان لوگوں کے گھر میں پیدا ہو گئے جو خود ہمارے ہی جیسے مسلمان تھے۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ ہمارا شمار ان میں بھی نہیں ہوتا جنہیں قرآن نے منافقین کہہ کر پکارا تھا۔ یعنی وہ جو دل سے تو کافر ہوں لیکن کسی مصلحت کے تابع زبان سے اپنے آپ کو مسلمان کہیں۔ ان حقائق کے پیش نظر دیکھئے تو (قرآنی نقطۂ نگاہ سے) ہمارا وجود ایک چیستان سے کم نہیں۔

لیکن اس کے باوجود، بعض حقائق ایسے ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً

(۱) ہم نے بیشک اسلام کو علیٰ وجہ البصیرت اختیار نہیں کیا لیکن غیر شعوری طور پر ہماری اس سے قلبی وابستگی ایسی شدید ہے کہ (وہ جہالت کی اور بات ہے) کفر کی کسی بات کو زبان پر لانے سے ہمارا دل دہل جاتا ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ ہم کچھ بھی ہیں، کوئی غیر مسلم قوم ہمیں اپنے میں سے نہیں سمجھتی۔ وہ ہمیں اپنے سے الگ قرار دیتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ اس کے باوجود کہ ہم میں کوئی بات ایسی نہیں جس کی بنا پر قرآن کی بارگاہ سے ہمیں مومن یا مسلم ہونے کی سند عطا ہو جائے، ایک بات ایسی ہے جو ہم میں ابھی تک بطور قدر مشترک موجود ہے اور جس کی بنا پر ہم ایک منفرد تشخص کے حامل اور غیر مسلموں سے الگ قرار پاتے ہیں۔ اور وہ ہے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف ہماری

نسبت ہو، آپ کی ذات اقدس و اعظم کے ساتھ ہماری والہانہ شیفتگی اور جاں سپارانہ جذبۂ محبت و احترام — یہ وہ نام نامی اور اسم گرامی ہے جس کے متعلق ہر مسلمان کے دل کی گہرائیوں سے یہ آواز ابھرتی ہے کہ

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو — چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو — بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

اور یہیں سے میری بات آگے چلتی ہے۔

۷ — اُمّت

یہ بتایا جا چکا ہے کہ اسلام، مذہب نہیں، دین ہے۔ مذہب انفرادی ہوتا ہے، لیکن دین اجتماعی نظام کا نام ہے۔ اجتماعیت کا تقاضا ایک جماعت کا وجود ہے۔ یعنی اجتماعی نظام کے لئے ایک جماعت کا وجود ناگزیر ہے۔ عصرِ حاضر میں اس کے لئے قوم یا نیشن کا لفظ رائج ہے۔ قرآن کریم نے اس کے لئے اُمّت کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس نے جماعتِ مومنین کے متعلق کہا ہے کہ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۳/۱۱۰) "تم بہترین قوم (امت) ہو جسے نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے متشکل کیا گیا ہے"۔ مذہب اور دین میں یہی بنیادی فرق ہے۔ مذہب پر، خلوت گاہوں میں، خانقاہوں میں، غاروں میں جنگلوں میں، انفرادی طور پر عمل پیرا ہوا جا سکتا ہے۔ دین پر اس طرح عمل پیرا نہیں ہوا جا سکتا ہے۔ اس میں وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ (۲/۴۳) "جھکنے والوں کے ساتھ مل کر جھکنا" لازمی ہے۔ دین کی رو سے عطا ہونے والی جنت کے متعلق بھی ارشاد ہے کہ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي (۸۹/۲۹-۳۰) "میرے بندوں میں شامل ہو جا اور جنت میں داخل ہو جا"۔ عصرِ حاضر کے سیاسی لغت میں قوم (نیشن) ان افراد کے مجموعہ کا نام ہے جو کسی خاص خطۂ زمین یا خاص مملکت کی حدود کے اندر رہتے ہوں خواہ ان کے نظریاتِ زندگی اور تصوراتِ حیات کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کے برعکس، اسلام میں اُمت، ان افراد کے مجموعہ کا نام ہے جو قرآن کریم کی صداقتوں پر ایمان لانے کے بعد اس جماعت میں شامل ہوتے ہوں، خواہ وہ دنیا کے کسی ملک میں رہتے ہوں، کوئی زبان بولتے ہوں اور کسی نسل یا قبیلہ یا خاندان سے متعلق ہوں۔ یہ جماعت یا امت، ایک مملکت قائم کرتی ہے تاکہ اس میں اسلام ایک زندہ نظام کی شکل میں کارفرما ہو۔ اس مملکت کی حدود میں مسلم بھی ہوں گے اور غیر مسلم بھی۔ ان دونوں کی حیثیتوں اور حقوق و فرائض میں فرق ہوگا۔ بنا بریں، اس مملکت میں بسنے والے تمام افراد کے متعلق واضح طور پر متعین اور معلوم ہونا چاہیئے کہ فلاں مسلم ہے اور فلاں غیر مسلم۔ اس وقت اسلام نے چونکہ ایک مذہب کی شکل اختیار کر رکھی ہے اس لئے اس میں کفر اور اسلام (یعنی کسی کے مسلم یا غیر مسلم ہونے کے فیصلے) مذہبی پیشوائیت کے فتووں کی رو سے ہوتے ہیں۔ ان فتووں سے فتویٰ دینے والوں کی انانیت یا پندارِ نفس کی تسکین تو ہو جاتی ہے لیکن ان کا عملی مفہوم کچھ نہیں ہوتا۔ جس مسلمان پر کفر کا فتویٰ لگا دیتے ہیں وہ بدستور مسلمان رہتا ہے۔ اس کی، فتوے سے پہلے اور بعد کی حیثیتوں میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ لیکن دین میں مسلم اور غیر مسلم میں فرق کرنا مملکت کے لئے آئینی طور پر ضروری ہوتا ہے کیونکہ جیسا

ابھی ابھی کہا جا چکا ہے ان دونوں کی حیثیتوں میں آئینی طور پر فرق ہوتا ہے۔ دین میں جب مملکت کسی فرد کے متعلق فیصلہ دیتی ہے کہ وہ مسلم نہیں تو وہ، اس فیصلے کے ساتھ اس گروہ کا فرد قرار پا جاتا ہے جسے غیر مسلم کہا جاتا ہے اور جس کے حقوق و فرائض مسلم جماعت سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ اس مملکت کے آئین میں مسلم اور غیر مسلم میں فرق کرنے کا واضح اور متعین معیار موجود ہو۔ بالفاظِ دیگر، ایک ایسا معیار موجود ہو جس کی رو سے فیصلہ کیا جا سکے کہ ایک شخص اس اُمت کا فرد ہے یا نہیں۔

اس سے یہ اہم سوال ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ دین میں امت کی تشکیل کا معیار کیا ہے۔ یعنی کون شخص اس امت کا فرد بن سکتا ہے؟ اسے سمجھنے کے لیے دو ایک مثالیں سامنے لائیے۔ ایک یہودی، اس تعلیم کی صداقت پر ایمان رکھنے کا مدعی ہوتا ہے، جو انبیاءؑ بنی اسرائیل کو خدا کی طرف سے ملی تھی لیکن وہ اس سلسلۂ انبیاء کو حضرت عیسیٰؑ سے پہلے ختم کر دیتا ہے۔ وہ حضرت عیسیٰؑ کو ان میں شامل نہیں کرتا۔ اس اعتبار سے وہ عیسائیوں سے الگ یہودی قوم کا فرد رہتا ہے لیکن جونہی وہ حضرت عیسیٰؑ کو بھی اس سلسلہ میں شامل کر لیتا ہے وہ امتِ یہودیہ سے کٹ کر امتِ عیسوی میں شامل ہو جاتا ہے۔

ایک عیسائی حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک، تمام انبیاء کو مانتا ہے لیکن اس سلسلہ کو حضرت عیسیٰؑ پر ختم کر دیتا ہے۔ اُسے اُن سے آگے نہیں بڑھاتا۔ جب تک وہ اس مسلک پر قائم رہتا ہے، امتِ عیسوی کا فرد کہلاتا ہے۔ لیکن جونہی وہ اس سلسلہ کو آگے بڑھا کر، حضور نبی اکرمؐ کی رسالت پر ایمان لاتا ہے۔ یعنی سلسلۂ انبیاء کو حضرت عیسیٰؑ پر ختم سمجھنے کے بجائے، اُن کے بعد ایک اور نبی کی نبوت پر ایمان لے آتا ہے۔۔۔ وہ امتِ عیسوی سے کٹ کر امتِ محمدیہ کا فرد قرار پا جاتا ہے۔ یاد رکھئے۔ یہ عیسائی، نبی اکرمؐ کی نبوت پر ایمان لانے سے، حضرت عیسیٰؑ یا آپ سے پہلے کے انبیاء کی نبوت سے انکار نہیں کرتا۔ انہیں بدستور نبی مانتا ہے۔ لیکن پہلے یہ حضرت عیسیٰؑ کو اس سلسلہ کی آخری کڑی مانتا تھا، اب یہ انہیں آخری کڑی نہیں مانتا، اس سلسلہ کو اُن کے بعد بھی جاری سمجھتا ہے اور اسی بنا پر حضور نبی اکرمؐ کی نبوت پر ایمان لاتا ہے۔

ان حقائق سے واضح ہے کہ ایک شخص اس نبی کی امت کا فرد کہلاتا ہے جسے وہ سلسلۂ انبیاءؑ کی آخری کڑی سمجھتا ہے۔ جونہی وہ اس سلسلہ کو آگے بڑھاتا ہے اس کا سلسلہ سابقہ نبی کی اُمت سے منقطع ہو جاتا ہے اور وہ اس کے بعد کے نبی کی اُمت کا فرد قرار پا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، انسان، وحی کے حقائق پر ایمان لانے سے تو یوں کہیے کہ خدا پر ایمان لاتا ہے۔ لیکن امت میں وہ اس نبی کی شامل ہوتا ہے جسے وہ سلسلۂ انبیاءؑ کی آخری کڑی مانتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو کس قدر بلیغ انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ:

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید — وز رسالت در تنِ ما جاں دمید
ما ز حکمِ نسبتِ او ملتیم — اہلِ عالم را پیامِ رحمتیم
فرد از حق، ملت از وے زندہ است — از شعاعِ مہرِ او تابندہ است
پس خدا برما شریعت ختم کرد — بر رسولِ ما رسالت ختم کرد

رونق از ما محفلِ ایام را
او رسل را ختم و ما اقوام را

اور یہ وہ حقیقت جس کی وضاحت کے لئے قرآن کریم نے جماعت مومنین' امت محمدیہ سے کہا کہ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۲/۱۴۳)۔ اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنایا تاکہ تم تمام نوع انسان کے اعمال کے نگران بنو' اور رسول تمہارے اعمال کا نگران ہو۔ لہٰذا' امت محمدیہ کا فرد ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ شخص

(۱) قرآن کریم کو' خدا کی طرف سے عطا کردہ' واحد' مکمل' غیر متبدل اور محفوظ ضابطۂ حیات مانے۔

(۲) اور حضور نبی اکرمؐ کو سلسلۂ انبیائے کرام کی آخری کڑی تسلیم کرے۔

اسی کو مسلمان کہیں گے۔

۸ — دو قومی نظریہ

یہ امت عصر حاضر کی اصطلاح میں' ایک قوم کہلائے گی' خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں بستی ہو' — اور اس امت کے علاوہ' دنیا کے تمام باشندے' دوسری قوم کے افراد — اس طرح' ساری دنیا کے انسان' دو قوموں میں بٹ جائیں گے — مسلم اور غیر مسلم — قرآن کریم کے الفاظ میں؛

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (۶۴/۲)

خدا نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر تم میں سے کچھ مومن ہو گئے کچھ کافر۔

یعنی پیدائش کے اعتبار سے' صرف انسان پیدا ہوتے ہیں۔ پھر وہ نظریۂ زندگی کے معیار کے مطابق' دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں — ایک گروہ مومنین کا دوسرا غیر مسلموں کا' اسی کو "دو قومی نظریہ" کہا جاتا ہے۔ یاد رکھئے۔ دو قومی نظریہ "نہ تو ہندوستانی باشندوں کی نسبت سے وجود میں آیا تھا اور نہ ہی یہ تحریک یا مطالبۂ پاکستان کا پیدا کردہ تصور تھا۔ یہ اسلام کی ایک ابدی صداقت ہے جو اس دن ظہور میں آئی تھی جب خدا نے پہلے پہل انسانوں کو وحی عطا کی۔ اور یہ ابد تک قائم رہے گی۔ دو قومی نظریہ (TWO NATION THEORY) کی اساس خود اسلام ہے۔ اس کا تعلق نہ پاکستان سے ہے نہ نام نہاد "بنگلہ دیش" سے۔ جب تک دنیا میں' ایک شخص بھی مسلم رہے گا' دو قومی نظریہ زندہ رہے گا۔

چونکہ اس سوال نے آجکل خاص اہمیت اختیار کر رکھی ہے' اس لئے اس کی مزید وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ میں نے بتایا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے

(۱) دنیا کے تمام مسلمان' ایمان کے اشتراک کی بناء پر ایک قوم کے افراد ہوں گے۔ اس قوم (یا امت) کے اندر نسل' زبان' جغرافیائی یا سیاسی حدود کے امتیازات' مختلف قوموں کی تشکیل' اسلام کے بنیادی تصور کے خلاف ہے۔ اور

(۲) کوئی غیر مسلم' اس (مسلم) قوم کا فرد قرار نہیں پا سکتا خواہ وہ انہی کی مملکت کے اندر کیوں نہ رہتا ہو۔ اسلام کی یہ بنیادی حقیقت مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ ہم نے کوشش کی کہ ہندوستان میں ایک الگ خطہ زمین حاصل کر کے' اس میں' اس تصور کا احیاء کریں۔ اور جب یہ تصور یہاں عملاً قائم ہو جائے تو پھر اس سلسلہ کو دوسرے ممالک تک وسعت دیں۔

بھی بڑھایا جائے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر ہم نے ہندوستان میں دو قومی نظریہ کی اشاعت کی اور اس میں ہم بفضلِ ایزدی کامیاب ہو گئے۔ لیکن تشکیلِ پاکستان کے بعد ہم نے خود پہلے اس کے ایک حصہ کی تردید کر دی۔ یعنی پاکستان کی حدود میں بسنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک قوم قرار دیدیا۔ بالفاظِ دیگر، ابھی ابھی ہم ہندوستان میں کہہ رہے تھے کہ مملکتِ ہند میں بسنے والے مسلمان اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد قرار نہیں پا سکتے لیکن جونہی ہم نے واہگہ کی سرحد پار کی، ہم نے اقرار و اعلان کر دیا کہ پاکستان کی حدود تک بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد ہیں۔ ہم نے اس سے اسلام کا مذاق اڑایا۔ اپنا مذاق اڑایا اور دنیا کی نگاہوں میں مضحکہ بن گئے۔ لیکن فطرت کے اٹل قوانین نے ہمارا مذاق اس طرح اڑایا کہ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔

اب ہم اس نظریہ کے دوسرے حصہ کا مذاق اڑا رہے ہیں جب کہہ رہے ہیں کہ مغربی پاکستان کے مسلمان ایک قوم نہیں بلکہ چار قوموں میں منقسم ہیں۔ یعنی یہاں کے مسلمان اور غیر مسلم تو ایک قوم کے افراد ہیں، لیکن خود مسلمان ایک قوم کے افراد نہیں، ان کی چار الگ الگ قومیتیں ہیں۔ یا للعجب۔ میں، برادرانِ عزیز! اس قرآنی بصیرت کی شہادت پر جس کے ذریعہ مجھے بتوفیقِ ایزدی حاصل ہوتی ہے، دل کی پوری قوت سے اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ یہ دونوں تصورات اسلام کے یکسر خلاف ہیں۔ یعنی یہ تصور کہ پاکستان (یا دنیا کے کسی اور حصہ کے) مسلمان اور غیر مسلم وطن کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم کے افراد ہیں، اور خود مسلمانوں کے اندر مختلف قوموں کا وجود ممکن ہے۔ آپ اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر جو جی میں آئے سمجھئے اور کیجئے۔ لیکن یہ دونوں نظریات اسلام کے بنیادی تصورات کے خلاف ہیں؛ اور اگر آپ اس مملکت کو اسلامی بنانا چاہتے ہیں تو آپ کو ان دونوں نظریات کو مردود قرار دینا پڑے گا۔

کہا جاتا ہے کہ اسلام نے شعوب اور قبائل کا امتیاز روا رکھا ہے اور انہی کو ہم مختلف قومیتیں کہتے ہیں۔ شعوب و قبائل سے ان کا اشارہ سورۂ حجرات کی اس آیت کی طرف ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ
لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ (۴۹/۱۳)

لیکن اس آیت کو بطورِ دلیل پیش کرنے والے اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ یہ آیت خود ان کے دعوے کی تردید کرتی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ تمام انسانوں کو مرد و عورت کے اختلاط سے پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے انسان ہونے کی جہت سے ان میں کسی قسم کا فرق اور امتیاز نہیں۔ اگر امتیاز ہے تو صرف ایمان کے اشتراک اور سیرت و کردار کی بلندی کا (اتقٰکم)۔ باقی رہے تمہارے قبیلے اور خاندان، سو ان کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ تم ایک دوسرے سے متعارف ہو سکو۔ زمانۂ نزولِ قرآن کے عرب بالعموم صحراؤں میں خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ وہاں اب بھی آبادی کی اکثریت کا یہی طرزِ بود و ماند ہے۔ اس قسم کی صحرا نشینی کی زندگی میں بجز قبائلی نسبت کے ایک دوسرے کو پہچاننے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ قرآن کریم نے کہا کہ اسلام لانے کے بعد تم سب ایک امت کے افراد بن جاؤ گے، لیکن جب تک تم میں کوئی اور علامتِ تعارف پیدا نہ ہو، قبیلوں اور خاندانوں کی موجودہ علامتیں یہ مقصد پورا کرتی رہیں گی۔ باہمی تعارف کی جب اور علامات وجود میں آجائیں گی تو قبیلوں اور خاندانوں کی علامتیں خود بخود مٹ جائیں گی۔ چنانچہ آج ہم جب اپنے ہاں کی متمدن (شہری) زندگی کو دیکھتے ہیں تو اس میں ذاتوں اور گوتوں کی علامات وجۂ تعارف نہیں رہیں۔ باہمی تعارف کا ذریعہ اور قسم کی علامات بن چکی ہیں۔ اس وجہ سے اب یہاں ذاتوں اور گوتوں کا تعارف

نہیں رہا۔ بس یہ تھا مقصد عربوں کے ہاں شعوب وقبائل کی تعارفی علامات کے باقی رکھنے کا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جہاں کہیں یہ محسوس ہوا کہ قبائلی امتیاز، وجۂ تعارف سے آگے بڑھ کر کسی اور امتیاز کا موجب بن رہا ہے، اسے شدت سے روک دیا گیا۔ ایک جنگ میں، دو مسلم سپاہیوں میں کسی بات پر باہمی جھگڑا ہو گیا تو ان میں سے ایک نے زمانۂ جاہلیت کے طریق کے مطابق، غالباً غیر شعوری طور پر، اپنے قبیلہ کو مدد کے لئے پکارا اور دوسرے نے اپنے قبیلہ کو۔ جب حضورؐ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ سخت برافروختہ ہوئے اور ان سے کہا کہ تم لوگ اسلام لانے کے بعد، پھر عصبیت جاہلیہ کی طرف لوٹ گئے ہو؟ اور یہی وہ جاہلیت کی عصبیتیں تھیں، جن کے متعلق حضورؐ نے اپنے آخری حج کے خطبہ میں اعلان فرمایا تھا کہ میں نے ان سب کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا ہے۔ حیرت ہے کہ وہ عصبیتیں جنہیں حضورؐ نے اس طرح اپنے پاؤں تلے روند ڈالا تھا اب انہیں قومیتوں کا نام دے کر از سرِ نو زندہ کیا جا رہا ہے اور بجائے اس کے کہ اس پر ندامت محسوس ہو کہ ہم اس قسم کی غیر اسلامی حرکتیں کیوں کر رہے ہیں، سینہ تان کر کہا جاتا ہے کہ اسلام نے ان کی اجازت دی ہے۔ جن لوگوں نے اسلام کو سمجھا تھا ان کی تو کیفیت یہ تھی کہ جب حضرت سلمانؓ پارسی سے پوچھا گیا کہ نام؟ تو آپ نے کہا، سلمان۔ اور جب پوچھا گیا کہ باپ کا نام؟ تو آپ نے فرمایا—اسلام—وہ لوگ ولدیت کے امتیاز سے بھی امت میں تفرق پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے اور ہم آج اپنے مسلمان ہونے کے زمانے سے پہلے کے نسلی امتیازات، اور انگریزوں کی کھینچی ہوئی صوبوں کی لکیروں کی تفریقات سے، الگ الگ قومیتیں متشکل کر رہے ہیں اور انہیں اسلامی قرار دے رہے ہیں۔ کس قدر مظلوم ہے آج دنیا میں اسلام کہ جس کا جی چاہتا ہے اس کی طرف منسوب کر کے اسے بدنام کرتا پھرتا ہے۔ کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ یاد رکھئے جب تک ہم بلوچ، سندھی، پنجابی، پٹھان کے امتیازات کو مٹا نہیں دیں گے اسلام کے حصار میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔

۹۔ نظریۂ پاکستان

ہم نے دیکھا ہے کہ اسلام، بہ حیثیت دین (نظامِ زندگی) اسی صورت میں کارفرما ہو سکتا ہے جب اس کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ اگر اپنی آزاد مملکت نہ ہو تو یہ صرف مذہب کی شکل میں باقی رہ سکتا ہے۔ ہندوستان میں اسلام مذہب کی حیثیت میں باقی رہ سکتا تھا۔ دین کی شکل اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ اسے دین کی صورت میں متشکل کرنے کے لئے ہم نے ایک آزاد مملکت کے حصول کا مطالبہ کیا۔ اسی کو نظریۂ پاکستان کہتے ہیں۔ یعنی ایک ایسی مملکت کا حصول جس میں اسلام ایک عملی نظامِ حیات کی شکل میں کارفرما ہو۔ بنا بریں، نظریۂ پاکستان بھی کوئی جداگانہ تصور نہیں تھا۔ یہ اسلام کا بنیادی تقاضا ہے۔ حامیانِ نظریۂ پاکستان سے مراد وہ لوگ تھے جو اس حقیقت پر ایمان رکھتے تھے کہ اسلام صرف اپنی آزاد مملکت میں دین کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ اپنی آزاد مملکت نہ ہو تو اس کے دین بننے کا امکان نہیں ہوتا۔ اس صورت میں اسلام مذہب بن جاتا ہے اور اسٹیٹ سیکولر، جو یکسر غیر اسلامی تصور ہے۔

۱۰۔ اسلامک اسٹیٹ

قرآن کریم نے اسلامی اور غیر اسلامی مملکت میں اس طرح واضح اور بیّن طور پر فرق کر کے بتا دیا ہے کہ اس کے سمجھنے میں نہ کسی قسم کا ابہام ہو سکتا ہے، نہ التباس۔ اس نے کہا ہے کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو لوگ خدا کی نازل کردہ کتاب (قرآن کریم) کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہی کافر ہوتے ہیں۔

قائدِ اعظمؒ نے اسی حقیقت کو چار لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا جب کہا کہ

اسلامی مملکت کی آزادی اور پابندی کی حدود، خدا کی کتاب متعین کرتی ہے۔

عصرِ حاضر کے سیاسی تصور کی رو سے "آزاد اور خود مختار ریاست" (SOVEREIGN STATE) وہ ہوتی ہے جو اپنے ہر فیصلہ میں کاملۃً آزاد ہو اور کوئی اتھارٹی ایسی نہ ہو جو اس پر کسی قسم کی پابندی عائد کر سکے۔ قرآن کی رو سے، خدا کی کتاب وہ حدود متعین کرتی ہے جن کے اندر رہتے ہوئے اسلامی مملکت آزاد اور خود مختار ہوتی ہے۔ کتاب اللہ کی اسی اتھارٹی کو خدا کی حاکمیت یا اقتدارِ اعلیٰ کہتے ہیں۔ عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ خدا کا اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرنے کے بعد، مملکت کی (SOVEREIGNTY) باقی نہیں رہتی۔ یہ اعتراض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ دنیا کی ہر سٹیٹ، دوسری سٹیٹس کے معاملات میں ساورن ہوتی ہے لیکن اپنے آئین کی پابندی اس پر بھی لازم ہوتی ہے۔ اپنے آئین کی پابندی سے اس مملکت کی ساورنٹی پر کوئی حرف نہیں آتا۔ یہی کیفیت اسلامک سٹیٹ کی ہوتی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ دنیا کی عام سٹیٹس اپنے لئے آپ آئین مرتب کرنے، یا اس میں رد و بدل کرنے کی مجاز ہوتی ہیں، لیکن اسلامک سٹیٹ اپنے آئین کے اصول، و حدود خود مرتب نہیں کر سکتی۔ یہ خدا کی طرف سے متعین کردہ ہیں، جن سے نہ اسلامک سٹیٹ انحراف کر سکتی ہے نہ ان میں تغیر و تبدل۔ ان غیر متبدل اصولوں کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے یہ سٹیٹ اپنے داخلی معاملات میں بھی ساورن ہوتی ہے اور خارجی معاملات میں بھی ساورن۔ یاد رکھئے، تھیوکریسی سٹیٹ سے مراد ہوتی ہے وہ مملکت جس کے حدود اختیارات پر کسی قسم کا کنٹرول نہ ہو۔ یہ اصطلاح اسلامک سٹیٹ کی ضد ہے۔ اس اصطلاح کو پسند اختیار کر کے یہ کہنا کہ یہ اسلام کے منافی نہیں، یا خود فریبی ہے یا فریب دہی۔

۱۱ — جمہوریت

یہیں سے مغربی جمہوریت اور اسلامی شورائیت کا فرق سامنے آ جاتا ہے۔ مغربی نظامِ جمہوریت میں، عوام کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہوتا ہے جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ عوام کے نمائندے، جس قسم کا آئین جی چاہے مرتب کریں، اور جس قسم کے قوانین جی چاہے وضع کریں۔ ان کے اس اختیار پر کوئی پابندی نہیں عائد کی جا سکتی۔ اس کے برعکس، اسلامک سٹیٹ میں امت کے نمائندے، مملکت کا آئین اور حکومت کے لئے قوانین، باہمی مشاورت سے، ان حدود کے اندر رہتے ہوئے وضع کر سکتے ہیں جو کتاب اللہ نے متعین کی ہیں۔ کتاب اللہ کی یہ حدود غیر متبدل رہتی ہیں، اور ان کے اندر رہتے ہوئے مرتب کردہ قوانین و ضوابط، حالات کے تقاضے اور زمانے کی ضرورتوں کے مطابق بدلے جا سکتے ہیں۔ ان قوانین و ضوابط کو شریعت کہا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر اسلامی مملکت میں دین تو غیر متبدل رہے گا لیکن شریعت بدلتی رہے گی۔ یہ شریعت، مرتب کردہ ہوگی امت کے نمائندوں کی۔ اس لئے اسلامک سٹیٹ میں مذہبی پیشوائیت کا وجود نہیں ہوگا۔ لہٰذا، یہ سٹیٹ تھیاکریٹک بھی نہیں ہوگی۔

قانون سازی کے سلسلہ میں قرآن کریم نے ایک عظیم حقیقت بیان کی ہے۔ ہر حکومت کا بنیادی فریضہ عدل قرار دیا جاتا ہے، اور عدل سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ جو فیصلہ ملک کے مروجہ قانون کے مطابق ہو وہ عدل (JUSTICE) ہے۔ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ جو فیصلہ قانون کے مطابق ہوا سے عدل کہا جائے گا لیکن اگر وہ قانون ہی ایسا

ہے جو ظلم پر مبنی ہے تو اسی کے مطابق فیصلہ کو عدل کیسے کہا جا سکے گا؟ لہٰذا دیکھنے کی بات یہ ہوگی کہ وہ قانون کس قسم کا ہے۔ مغربی اندازِ حکومت کی رو سے دیکھا صرف یہ جاتا ہے کہ جو قانون مملکت میں نافذ کیا جا رہا ہے وہ مملکت کے آئین اور قانون سازی کے ضوابط پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ قانون ان شرائط کو پورا کرتا ہے تو وہ جائز (VALID) قرار پائے گا اور اس کے مطابق، متنازعہ فیہ معاملات کے فیصلے مبنی بر عدل تسلیم کئے جائیں گے۔ لیکن قرآن کی رو سے کسی قانون کے جائز یا ناجائز قرار پانے کا صرف یہی معیار نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ان تمام شرائط کے ساتھ یہ دیکھنا بھی ضروری ہوگا کہ وہ قانون ان مستقل اقدار و اصول کے بھی مطابق ہے یا نہیں جو کتاب اللہ میں مذکور ہیں۔ اگر وہ ان کے مطابق ہے تو وہ جائز قانون ہے۔ اگر ان سے ٹکراتا ہے تو ناجائز ہے خواہ وہ آئینِ مملکت کی تمام شرائط کو بھی پورا کیوں نہ کر رہا ہو! اُس کا اعلان یہ ہے کہ اسلامی مملکت وہ ہے جس کا انداز یہ ہو کہ یَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ (۷/۱۸۱) وہ الحق کے مطابق لوگوں کو چلاتی ہے اور اسی کے مطابق عدل کرتی ہے۔ اَلْحَقّ (THE TRUTH) قرآن کی رو سے وحیِ خداوندی کو کہا جاتا ہے۔ جو مملکت ایسا کرتی ہے وہ اسلامی مملکت کہلاتی ہے۔ جو ایسا نہیں کرتی وہ سیکولر (غیر اسلامی) ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ سیکولر کا کوئی مفہوم نہیں۔

۱۱۔ مملکت کا مذہب

کچھ عرصہ سے ہمارے ہاں ایک اور نعرہ بھی بلند کیا جا رہا ہے اور وہ یہ کہ آئین میں یہ شق رکھی جانی چاہیئے کہ مملکتِ پاکستان کا مذہب اسلام ہوگا۔

پچھلے دنوں مستقل آئین کے اصولوں کے سلسلہ میں، مختلف سیاسی پارٹیوں کا جو اتفاق رائے ہوا ہے، اس میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ مملکت کا مذہب (STATE RELIGION) اسلام ہوگا۔ انہوں نے فیصلہ تو ایسا کر لیا، لیکن اگر آپ ان سے پوچھیں کہ اس کا مطلب کیا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں بتا سکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب ایک جیتے جاگتے انسان کا ہوتا ہے۔ ہم ایک فرد سے پوچھ سکتے ہیں کہ اس کا مذہب کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ اگر کچھ ہم مذہب افراد ایک جماعت کی شکل اختیار کر لیں، تو یہ کہا جائے گا کہ اس جماعت کا یہ مذہب ہے۔ اس کے معنی بھی یہی ہوں گے کہ وہ جماعت جن افراد پر مشتمل ہے ان کا مذہب یہ ہے۔ لیکن مملکت نہ کوئی فرد ہوتی ہے، نہ افراد کا مجموعہ۔ وہ ایک مجرد (ABSTRACT) سی شے ہے جس کی کوئی جامع تعریف بھی آج تک نہیں کی جا سکی۔ سمجھنے کے لئے یوں کہئے کہ مملکت کسی خطۂ زمین کے اندر ایک سیاسی نظام کا نام ہوتا ہے اور نظام کا کوئی مذہب نہیں ہو سکتا۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں نظام اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔ لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ فلاں نظام کا 'مذہب' اسلام ہے۔ لہٰذا یہ فیصلہ کہ مملکتِ پاکستان کا مذہب اسلام ہوگا محض سطحی جذباتیت ہے جس کا عملی مفہوم کچھ نہیں۔ مطالبہ یہ ہونا چاہیئے کہ مملکتِ پاکستان کو اسلامی مملکت ہونا چاہیئے، اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اسلامی مملکت سے مراد ہوگی وہ مملکت

جس کی آزادی اور پابندی کی حدود خدا کی کتاب (قرآن کریم)

متعین کرے۔

۱۲- سیکولر اسٹیٹ کی مزید وضاحت

اس سے یہ حقیقت بھی سمجھ میں آسکتی ہے کہ سیکولر اسٹیٹ کسے کہا جاتا ہے۔ اجمالاً اتنا کہنا کافی ہوگا کہ جو سٹیٹ اسلامک نہیں، وہ اسلام کے نقطۂ نگاہ سے سیکولر ہے۔ یعنی اسلامی نقطۂ نگاہ سے غیر اسلامی مملکت (UN-ISLAMIC STATE) اور سیکولر اسٹیٹ مترادف الفاظ ہیں۔ تفصیل میں جانے سے یہ کہا جائے گا کہ جس سٹیٹ کے فیصلے وحی کی رو سے عطا کردہ مستقل اقدار اور غیر متبدل اصول و احکام کے تابع ہوں گے وہ اسلامک ہوگی جس پر اس قسم کی پابندی نہیں ہوگی وہ سیکولر ہوگی۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، قرآن کریم نے ایک چھوٹی سی آیت میں اسلامک سٹیٹ اور سیکولر اسٹیٹ کا فرق نکھار اور ابھار کر بیان کر دیا ہے جب کہا کہ

مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو لوگ ما انزل اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ یعنی جو مملکت 'ما انزل اللہ' کے تابع رہتی ہے وہ اسلامی ہے۔ جو اس کے کنٹرول کو تسلیم نہیں کرتی وہ سیکولر ہے۔ سیکولرازم کی وضاحت لینن نے واضح الفاظ میں کر دی تھی جب کہا تھا کہ:

> ہم ان تمام ضوابطِ اخلاق کو مسترد کرتے ہیں جو کسی مافوق البشر سرچشمہ یا غیر طبقاتی تصور کے پیدا کردہ ہیں۔ ہم اعلانیہ کہتے ہیں کہ اخلاقیات کا اس قسم کا تصور فریب ہے۔ دھوکہ ہے۔ سرمایہ داری کا دھونس ہے کہ ان کا ضابطۂ اخلاق احکام خداوندی پر مبنی ہے۔ (ہم اس دعوے کو ٹھکرا دیتے ہیں) ہم خدا وغیرہ کچھ نہیں جانتے ہم اسے مانتے ہی نہیں۔ اخلاق انسانی معاشرہ ہی کا نام ہے۔ اس سے ماورا جو کچھ ہے فریب ہے۔ ہم کسی ابدی صداقت کے قائل نہیں۔ اس قسم کے اخلاق کے متعلق جس قدر افسانے وضع کئے گئے ہیں، ہم ان سب کا پردہ چاک کر دیں گے۔

آپ یہ نہ سمجھئے کہ سیکولرازم، کمیونسٹوں تک محدود ہے۔ نہیں۔ سیکولرازم کا ہر جگہ انداز یہی ہے۔ آج دنیا میں ہر جگہ سیکولر اسٹیٹس قائم ہیں۔ ان اسٹیٹس کا انداز یہ ہے کہ وہ امورِ مملکت میں مذہب کو دخل اندازی کی اجازت نہیں دیتیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ مذہب، انسان کا پرائیویٹ معاملہ ہے اس لئے اسے اس کی نجی زندگی تک محدود رہنا چاہیئے۔ ہر فرد کو اجازت ہے کہ وہ جس قسم کا مذہب جی چاہے اختیار کرے اسی طرح جیسے ہر فرد کو اجازت ہے کہ وہ جس قسم کے کپڑے جی چاہے پہنے یا جس قسم کا کھانا جی چاہے کھائے۔ لیکن مذہب یا اخلاق، مملکت پر کسی قسم کا کنٹرول نہیں کر سکتے اسی کو مذہب اور سیاست کی ثنویت (DUALISM) کہتے ہیں اس سے پرائیویٹ اور پبلک ضوابط اخلاق کی تفریق پیدا ہوتی ہے جس کے متعلق جوڈ لکھتا ہے کہ مغربی نظامِ سیاست میں

> پرائیویٹ زندگی کے اخلاق کا ضابطہ کچھ اور ہے اور امورِ مملکت کے لئے ضابطہ کچھ اور۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنی نجی زندگی میں دیانتدار، رحمدل، اور قابلِ اعتماد ہوتے ہیں ان کا بھی عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ جب انہیں اپنی مملکت کے نمائندہ کی حیثیت سے دوسری مملکت کے ... ... نمائندوں سے معاہدہ کرنا ہو تو وہاں وہ سب کچھ کر گزرنا کارِ ثواب سمجھے جسے وہ اپنی نجی زندگی میں نہایت شرمناک تصور

کرتے تھے۔

(GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MORALS AND POLITICS)

اور اسی حقیقت کو اٹلی کے مدبر (CAVOUR) نے سمٹا کر ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:

اگر ہم اپنی ذات کے لئے وہی کچھ کریں جو کچھ ہم نے مملکت کے لئے کیا ہے تو ہم کتنے بڑے شیاطین کہلائیں۔

یہی وہ نوبت ہے جس کے متعلق اقبال نے کہا تھا کہ:

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

لبرل سیکولرازم زیادہ سے زیادہ اتنا کرتی ہے کہ ہر مذہب کے پیروؤں کو اجازت دیتی ہے کہ وہ مذہبی عقائد جس قسم کے جی چاہے رکھیں اور اپنے شخصی قوانین (پرسنل لاز) جیسے جی چاہے مرتب اور اختیار کر لیں۔ اس سے آگے وہ مذہب کو کسی دائرے میں دخیل کار نہیں ہونے دیتی۔ تقسیمِ ہند سے پہلے، ہندو اسی قسم کی سیکولر اسٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے، اور نیشنلسٹ مسلمان، اور ان کے مذہبی راہ نما، علماء کرام، اسے عین مطابق اسلام قرار دیتے تھے۔ اسی کے خلاف جاری جنگ تھی، کیونکہ یہ تصور ایک کافرانہ اسٹیٹ کا ہو سکتا ہے، اسلامی اسٹیٹ کا نہیں۔ عقائد اور پرسنل لاز تک اسلام کو تسلیم کرنا اور باقی شعبۂ حیات کو انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے تابع رکھنا، اس قسم کا کفر ہے جسے قرآن کریم نے سنگین ترین جرم قرار دیا ہے۔ اس کا ارشاد ہے اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ؕ کیا تم ایسا چاہتے ہو کہ اس کتاب کے ایک حصہ پر ایمان لاؤ اور دوسرے حصے سے کفر برتو۔ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ سو تم میں سے جو بھی ایسی روش اختیار کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ دنیاوی زندگی میں بھی ذلیل و خوار ہوگا اور قیامت کے دن بھی عذاب عظیم میں گرفتار۔

اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ جو لوگ یہاں سیکولر اسٹیٹ کا مطالبہ کرتے ہیں، قرآن کی بارگاہ سے ان کے متعلق کیا فیصلہ صادر ہوتا ہے!

۱۴۔ کتاب و سنت

اب ہم عزیزانِ من! اس سفر میں اس مقام پر پہنچ رہے ہیں جو سب سے زیادہ نازک ہے، اس لئے کہ مذہبی پیشوائیت نے مسلسل پراپیگنڈہ سے عوام کے جذبات کو اس قدر مشتعل کر رکھا ہے کہ اس سلسلہ میں لب کشائی سے ہر ایک ڈرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، دوسرے الفاظ میں، اس مملکت کو اس لئے حاصل کیا گیا تھا کہ اس میں اسلامی قوانین نافذ ہوں۔ لہذا، تشکیلِ پاکستان کے بعد سب سے پہلا مرحلہ یہ سامنے آیا کہ اسلامی قوانین وضع کس طرح کئے جائیں۔ ہمارے علماء کرام نے مطالبہ کیا کہ اس مقصد کے لئے آئین میں یہ شق رکھی جائے کہ مملکت کا کوئی قانون، کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ میں نے کہا کہ یہ مطالبہ ناممکن العمل ہے۔ کتاب و سنت کے مطابق کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا جو تمام فرقوں کے لئے قابل قبول ہو۔ اس پر ان حضرات نے یہ ترمیم کی کہ پرسنل لاز ہر فرقے کے الگ الگ ہوں۔ اور پبلک لاز کا مجموعہ کتاب و سنت کے مطابق مدون کر لیا جائے۔۔۔

میں نے کہا کہ اول تو پرسنل لاز اور پبلک لاز کی یہ تفریق خود کتاب و سنت کے خلاف ہے۔ نہ قرآن کریم نے ان میں کوئی تخصیص کی ہے اور نہ ہی عہدِ رسالتمآبؐ اور دورِ خلافتِ راشدہ میں ان میں کوئی تفریق تھی۔ دوسرے یہ کہ کتاب و سنت کے مطابق پبلک لاز کا بھی کوئی ایسا ضابطہ مدوّن نہیں ہو سکے گا جسے تمام فرقے متفق طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ اس کا جواب ان حضرات کے پاس کوئی نہیں تھا بجز اس کے کہ میرے خلاف پراپیگنڈہ کیا جائے کہ یہ شخص منکرِ حدیث ہے۔ منکرِ شانِ رسالت ہے۔ ایک الگ فرقہ ایجاد کرنا چاہتا ہے۔ ملحد ہے۔ بے دین ہے۔ اور نہ جانے کیا کیا ہے۔ اس پراپیگنڈہ میں جماعتِ اسلامی پیش پیش تھی' اور چونکہ پراپیگنڈا' کے فن میں یہ لوگ بڑے ایکسپرٹ ہیں' اس لئے ان کا یہ حربہ بڑا کامیاب رہا۔ اس حد تک کامیاب کہ آج آپ کسی کے سامنے پرویز یا طلوعِ اسلام کا نام لے دیجئے' وہ کانوں پر ہاتھ دھر لگ جائے گا خواہ اس کے فرشتوں کو بھی معلوم نہ ہو کہ پرویز کیا کہتا ہے اور طلوعِ اسلام کی دعوت کیا ہے بیس بائیس سال تک یہ پراپیگنڈہ مسلسل و متواتر جاری رہا۔ اس کے بعد آپ کو معلوم ہے کیا ہوا؟ ہوا یہ کہ اسی جماعت کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو اعلان کرنا پڑا کہ یہ حقیقت ہے کہ:

کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو پبلک لاز کے معاملے میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔ (ایشیا - ۲۳ر اگست ۱۹۶۹ء)

یعنی وہی بات جو "کافر و مرتد"، "ملحد و بے دین" "پرویز" بیس برس سے کہہ رہا تھا' اس کا اعتراف و اعلان ان حضرات کو بھی کرنا پڑا۔ (میں سمجھتا ہوں کہ مودودی صاحب پہلے دن سے اس بات کو جانتے تھے لیکن پرویز کے خلاف پراپیگنڈہ ایک خاص مقصد کے تحت کیا جا رہا تھا)۔

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوا کہ جب کتاب و سنت کے مطابق کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو، تو پھر اسلامی قوانین مرتب اور رائج کیسے ہوں! اس کا جواب مودودی صاحب نے یہ دیا کہ ملک میں اکثریت حنفیوں کی ہے اس لئے فقہ حنفی کو ملک کے قانون کی حیثیت سے نافذ کر دیا جائے۔ یہ وہی فقہ حنفی ہے جس کے متعلق مودودی صاحب خود فرما چکے تھے کہ

اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہدِ گذشتہ کی ایک تاریخی تحریک بن کر رہ گیا ہے۔

(سیاسی کشمکش۔ حصہ سوم۔ صفحہ ۳۶)

مودودی صاحب کی اس تجویز کے خلاف سب سے پہلے شیعہ حضرات نے صدائے احتجاج بلند کی' اور مرکزی ادارہ تحفظِ حقوقِ شیعہ نے ایک قرارداد منظور کی جس میں کہا کہ

شیعانِ پاکستان کسی ایسے پرسنل لا یا پبلک لا کو تسلیم نہیں کریں گے جس میں اہلِ تشیع کے سیاسی، مذہبی' اور معاشرتی حقوق کے تحفظ کی ضمانت نہ دی گئی ہو۔ (بحوالہ مساوات ۲۹؍)

یہ تھا شیعہ حضرات کا ردِ عمل مودودی صاحب کی تجویز کے خلاف۔ اب سنیوں کی طرف آئیے۔ سنیوں میں اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ' دو بنیادی فرقے ہیں۔ اہلِ حدیث نے اس تجویز کی شدت سے مخالفت کی اور کہا کہ فقہ حنفی ایک خاص فرقہ کی فقہ ہے جسے ہم صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ اس لئے وہ فقہ ملک کے اسلامی قوانین کی حیثیت سے ہمارے نزدیک قابلِ قبول

نہیں ہوگی۔ (ملاحظہ ہو، اہل حدیث کے ترجمان الاعتصام کی ۵ ہر ستمبر ۱۹۷۲ء کی اشاعت)۔ خود حنفیوں میں۔ دیوبندی اور بریلوی۔ دو ذیلی فرقے ہیں۔ سرحد کے حالیہ وزیر اعظم، مفتی محمود صاحب کا تعلق دیوبندی فرقہ سے ہے۔ انہوں نے اپنے صوبے میں جس اسلامی شریعت کا اجرا شروع کیا ہے، اس کے متعلق، حنفیوں کی اس دوسری شاخ کی طرف سے احتجاج ہو رہا ہے کہ

مفتی صاحب دیوبندیت کو مسلط کرنے کے لئے اپنے اقتدار کو استعمال کر رہے ہیں (تنظیم اہلحدیث ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

آپ کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں اس اختلاف کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ جس طرح لفظ "مسلمان" کا کوئی متفق علیہ مفہوم متعین نہیں، اسی طرح لفظ "سنت" کا بھی کوئی ایسا مفہوم متعین نہیں جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ اہل حدیث حضرات کے نزدیک، نبی اکرمؐ کی ہر حدیث 'سنت ہے'، اس کے برعکس، مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ سنت اس طریق عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بہ حیثیت ایک انسان ہونے کے، یا بہ حیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا اختیار کئے" (رسائل و مسائل حصہ اول۔ صفحہ ۳۱۰ تا ۳۱۱)۔ اس کے خلاف اہلحدیث حضرات نے کہا کہ "ہم آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے۔ اور سنت رسول کو ان حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔" (جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث۔ صفحہ ۲۳)۔ سنت کی جو تعریف، اہلحدیث حضرات نے پیش کی تھی اس کے متعلق مودودی صاحب نے کہا کہ

> میں عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور خطرناک تحریف دین ہے۔ (ایضاً صفحہ ۳۰۰)۔

یہ تو رہی "سنت" کی (DEFINITION) اب آئیے "سنت" کے ماخذ یعنی احادیث کی طرف۔ سو سب سے پہلے تو یہ معلوم ہے کہ سنیوں کے احادیث کے مجموعے الگ ہیں اور شیعہ حضرات کے الگ۔ پھر سنیوں میں، اہل حدیث کا عقیدہ یہ ہے کہ بخاری اور مسلم کی تمام احادیث کی صحت قطعی ہے۔ ان کا انکار کفر ہے اور ملت سے خراج کے مرادف۔ (جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث۔ صفحہ ۵۴ تا ۵۵)۔ یعنی بخاری اور مسلم کی کسی ایک حدیث کا انکار کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ اور مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے (ترجمان القرآن۔ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۵۲ء)۔ یہ کیفیت ہے، سنت اور اس کے ماخذ، احادیث کے متعلق اختلافات کی۔

لیکن اس داستان کا سب سے دلچسپ باب ابھی سامنے نہیں آیا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مودودی صاحب نے کہا ہے کہ کتاب و سنت کے مطابق کوئی ایسا مجموعہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو سب فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ اس کے باوجود، انہوں نے حکومت سے کہا ہے کہ مستقل آئین میں یہ شق درج ہونی چاہیئے کہ مملکت کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ یعنی جس چیز کے متعلق خود اعتراف ہے کہ ایسا ہونا ناممکن ہے، حکومت سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ اس ناممکن کو ممکن بنا دو۔ اور اس مطالبہ کی شدت کا یہ عالم ہے کہ حال ہی میں، صوبہ پنجاب کی جماعت اسلامی کے امیر سید اسعد گیلانی نے ایک بیان میں کہا ہے کہ اگر قرآن و سنت پر مبنی قوانین کا اجرا نہ کیا گیا تو

> جماعت اسلامی فی الحقیقت ملک بھر میں ایسی تحریک چلائے گی جس کی لہر خیبر سے کراچی تک نظر آئیگی۔ (نوائے وقت ۱۲ جنوری)

یہ ہے برادرانِ عزیز! وہ خونچکاں کھیل جو ملک میں کتاب و سنت کے نام پر کھیلا جا رہا ہے! مقصد اس کا واضح ہے۔ یعنی کہ:

(۱) جب کتاب و سنت کے مطابق کوئی متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب ہو نہیں سکے گا تو حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن کرنے کا نہایت "معقول" عذر ہاتھ آجائے گا کہ یہ لوگ اسلامی قوانین نافذ نہیں کرنا چاہتے۔

(۲) سنت کے اختلاف کی بنا پر ملک کے مختلف فرقوں میں سر پھٹول جاری رہے گی۔ اور

(۳) نوجوان طبقہ کے دل میں یہ خیال راسخ ہو جائے گا کہ اسلام کے مطابق کوئی حکومت قائم نہیں ہو سکتی اس لئے یہاں سیکولر اسٹیٹ قائم ہونی چاہیئے۔

میں پہلے دن سے یہ کہتا چلا آ رہا ہوں کہ ان تمام اختلافات کے باوجود، مسلمانوں کے تمام فرقوں میں کم از کم ایک قدر مشترک موجود ہے اور وہ ہے خدا کی کتاب جس پر سب کا ایمان ہے۔ پاکستان (یا کسی اور ملک میں) اسلامی حکومت صرف اس صورت میں قائم ہو سکے گی کہ قرآن کریم کو بنیاد قرار دے کر، حکومت ایک ضابطہ قوانین مرتب کرے جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہو۔ جب اس طرح مرتب کردہ قوانین کی سند، قرآن کریم کے احکام و اصول ہوں گے، تو کسی مسلمان کو اس سے اختلاف کی مجال نہیں ہو سکے گی۔ اس تجویز کے خلاف یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم تمام فرقوں میں قدر مشترک ہے لیکن قرآن کی تعبیر ہر فرقہ کی اپنی اپنی ہے۔ اس کا کیا علاج ہوگا؟ ایسا کہنے والے یہ نہیں سوچتے کہ تعبیر کا اختلاف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب مختلف فرقوں کو تعبیر کا حق انفرادی طور پر دیدیا جائے لیکن اگر یہی تعبیر اسلامی حکومت کی طرف سے ہو تو اس میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ قانون کے مقصد کے لئے اسلامی حکومت کی تعبیر سب کے نزدیک قابل قبول ہونی چاہیئے۔ اس کے سوا نہ اسلامی حکومت کے قیام کی کوئی صورت ہو سکتی ہے نہ اسلامی قوانین کی ترتیب و تدوین کی کوئی شکل۔

۱۴۔ مذہبی فرقے

فرقے مذہب میں ہوتے ہیں، دین میں مختلف فرقوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مذہب میں فقہیں الگ الگ ہوتی ہیں لیکن دین میں کوئی الگ فقہ نہیں ہوتی۔ اس میں مملکت کا ضابطہ قوانین ہوتا ہے جس کا اطلاق ہر ایک پر یکساں ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص یا جماعت کوئی الگ قانون وضع یا اختیار کرتی ہے تو وہ متوازی حکومت قائم کرتی ہے جو بغاوت کے مترادف ہوتا ہے۔ اسے ارتداد کہا جاتا ہے۔ یعنی حکومت سے سرکشی اختیار کرنا۔ قرآن کریم کی رو سے اس کی سزا موت ہے (۵/۳۳)۔ دین میں ایک امت ہوتی ہے۔ اس حکومت کا ایک ہی ضابطہ قوانین ہوتا ہے جس کی اطاعت ہر ایک پر لازم ہوتی ہے۔ اگر کسی معاملہ میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اس کے تصفیہ کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور اس کے فیصلے کے سامنے ہر ایک کو سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔

چونکہ مذہبی فرقے، ایک مملکت کے اندر رہتے ہوئے۔ شخصی قوانین کی حد تک ہی سہی۔ الگ الگ ضوابط قوانین کے پابند ہوتے ہیں، اس لئے قرآن کریم اسے شرک قرار دیتا ہے (۳۰/۳۱) اور مرکزِ حکومتِ خداوندی۔ یعنی رسول اللہ ﷺ سے کہتا ہے کہ ایسا کرنے والوں سے تیرا کوئی واسطہ نہیں (۶/۱۵۹)۔ پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تفریق کا تصور یکسر خلافِ اسلام ہے۔ دین ایک ایسا نظامِ حیات ہے جس میں عقائد، عبادات، باہمی معاملات۔ امورِ مملکت۔ پرسنل اور پبلک لاز وغیرہ سب باہمدگر پیوست، بلکہ ایک دوسرے میں مدغم ہوتے ہیں۔ ان میں تفریق شرک ہے۔

۱۵- حریتِ فکر

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلامی حکومت میں افراد کو فکری آزادی حاصل ہوتی ہے، اور اگر حاصل ہوتی ہے تو کس حد تک۔ اس اہم سوال کو سمجھنے کے لئے اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ

(۱) جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، دین کے معاملہ میں کوئی جبر و اکراہ نہیں ہوتا۔ ہر شخص دین کو علیٰ وجہ البصیرت، پوری فکری آزادی کے ساتھ اختیار کرتا ہے۔

(۲) جب ایک شخص اس طرح دین کو اختیار کر لیتا ہے تو اس پر دین کے قوانین و احکام کی اطاعت لازم آجاتی ہے۔ اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ دین کا نظام اختیار کر لینے کے بعد جس قانون کو اپنی فکر اور فہم کی رو سے اچھا سمجھے اس کی اطاعت کرے جسے اچھا نہ سمجھے اس کے خلاف چلا جائے۔ اس طرح دنیا کا کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا۔

(۳) قرآن کریم میں کچھ آیات قوانین یا ان کے اصولوں سے متعلق ہیں۔ انہیں وہ محکمات کہہ کر پکارتا ہے۔ ان کے علاوہ اس میں حقائق کائنات سے متعلق آیات ہیں جنہیں وہ متشابہات کہتا ہے یعنی وہ آیات جن میں حقائق کو تشبیہات اور استعارات کے انداز میں بیان کیا گیا ہے، ان حقائق کو غور و فکر اور فہم و تدبر کی رو سے سمجھا جا سکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس باب میں فکری اختلاف ہو سکتا ہے۔ ایک اختلاف مختلف زمانوں کی فکر میں ہوگا یعنی جوں جوں انسانی علم ترقی کرتا جائے گا فکر کے دائرے وسیع ہوتے جائیں گے، اس لئے کسی ایک دور کی فکر بہ حیثیت مجموعی دوسرے دور کی فکر سے مختلف ہوگی۔ پھر ہر دور میں مختلف افراد کی فکری صلاحیتیں اور علمی وسعتیں مختلف ہوں گی اس لئے ان کی فکر کے نتائج بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔ اس باب میں ہر ایک کو فکری آزادی حاصل ہوگی لیکن ایک شرط کے ساتھ۔ اور اس شرط کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ مثلاً حیات بعد الممات، اسلام کا بنیادی مسلمہ ہے۔ جو شخص اسلام کا مدعی ہے اس کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے گا کہ اس نے پوری پوری فکری آزادی کے بعد، علم و بصیرت کی رو سے اس مسلمہ کی صداقت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اس کے بعد سے اس کی اجازت نہیں ہوگی کہ جب جی چاہے اس مسلمہ کی صداقت سے انکار کر دے۔ اگر کسی وقت وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ مسلمہ (یا اس قسم کے دیگر قرآنی مسلمات) مبنی بر صداقت نہیں تو وہ اسلام کو چھوڑ کر غیر مسلموں کے زمرہ میں شامل ہو سکتا ہے۔ اس کی اسے ہر وقت اجازت ہوگی۔ لیکن اس کی اجازت نہیں ہوگی کہ اسلام کے دائرے میں رہتا ہوا، اس مسلمہ کی صداقت سے انکار کر دے۔

اب ایک قدم آگے بڑھئے۔ ایک مسلمان جو اس مسلمہ کی صداقت کا قائل ہے یہ سمجھتا ہے کہ مرنے کے بعد انسان پھر اسی جسم کے ساتھ، اسی شکل و صورت میں دوبارہ زندہ ہوں گے، لیکن دوسرا یہ سمجھتا ہے کہ وہ زندگی موجودہ مادی پیکروں کے ساتھ نہیں ہوگی۔ اس کی صورت اس سے مختلف ہوگی۔ تو ان دونوں کو اپنی اپنی فکر کے مطابق ایسا سمجھ لینے کی اجازت ہوگی۔ اس قسم کے فکری اختلاف کی بنا پر نہ آپس میں سر پھٹول ہوگی نہ ہی یہ چیز کسی فرقہ کی بنیاد بنے گی۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، دین میں فرقہ بندی کی گنجائش یا اجازت ہی نہیں ہو سکتی۔

۱۶- سیاسی پارٹیاں

دین میں جب مذہبی فرقے نہیں ہوں گے تو الگ الگ سیاسی پارٹیاں کس طرح وجود پذیر ہو سکیں گی؟ مذہبی فرقہ اور سیاسی پارٹی کی تفریق مذہب میں ہوتی ہے جس میں سیاست اور مذہب الگ الگ ہوتے ہیں۔ دین میں سیاست اور مذہب میں کوئی تفریق نہیں

ہوتی اس لیئے اس میں نہ کوئی مذہبی فرقہ ہوتا ہے نہ سیاسی پارٹی۔ اس میں امت مسلمہ، غیر مسلموں کے مقابلہ میں ایک پارٹی ہوتی ہے، خود اس امت کے اندر پارٹیاں نہیں ہوتیں۔ نہ ہی اس کے ایوان میں، امت دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہوتی ہے۔ ایک حزبِ اقتدار اور دوسری حزبِ اختلاف۔ قرآن کریم نے تمام نوع انسان کو دو قوموں میں تقسیم کر دیا ہے — ایک مومن اور دوسری کافر — انہی کو وہ دو حزب کہہ کر پکارتا ہے۔۔ ایک حزب اللہ اور دوسری حزب الشیطان (۲۲/۵۸؍ ۱۹)۔ اسلامی مملکت کے ایوان (پارلیمان) میں تمام کے تمام ارکان وہ ہوں گے جو قرآن کریم کے عطا کردہ اصول و اقدار پر ایمان رکھتے ہیں اور جن کا فریضہ ان اصول و اقدار کو قانونی شکل دے کر ملک میں نافذ کرنا ہے۔ اس ایوان میں غور و فکر اس مسئلہ پر ہوگا کہ ان اصولوں کو بہ حالات موجودہ نافذ کس طرح کیا جائے یعنی یہ لوگ، پارلیمان میں بیٹھ کر مملکت کے لئے اصول و اقدار وضع نہیں کریں گے بلکہ صرف یہ سوچیں گے کہ ان اصول و اقدار کی تنفیذ کے لئے طریقہ کونسا اختیار کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ہر رکن اپنی اپنی رائے پیش کرے گا اور جو فیصلہ ہوگا اس کا اطلاق ہر ایک پر ہو جائے گا۔ اس میں حزبِ اقتدار کے بجائے بھی عمالِ حکومت (کارندے) ہوں گے۔ جن کا فریضہ یہ دیکھنا ہوگا کہ اس فیصلہ پر ٹھیک ٹھیک عمل ہو رہا ہے، انہیں بھی کوئی خصوصی اختیارات حاصل نہیں ہوں گے۔ واضح رہے کہ اسلامی مملکت کی مجلس قانون ساز میں کوئی غیر مسلم شریک نہیں ہو سکے گا۔ بات بالکل واضح ہے۔ جو شخص کسی ضابطہ قوانین کی اصل و اساس کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتا، وہ اس کے قوانین کی ترتیب میں شریک کیسے ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی کوئی غیر مسلم مسلم قوم کا فرد قرار نہیں پا سکتا۔

۱۷ — صوبجاتی خود مختاری

اس وقت ہمارے ہاں جس اصطلاح نے سب سے زیادہ شہرت اور اہمیت حاصل کر رکھی ہے وہ ہے صوبجاتی خود مختاری یہی وہ شجرۃ الزقوم ہے جس کی وجہ سے آدھی مملکت ہم سے چھن چکی ہے اور باقی نصف کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ صوبوں (PROVINCES) کی حقیقت کیا ہے؟ انگریزوں نے انتظامی سہولت کے لئے ملک کو مختلف دائروں میں تقسیم کیا۔ سب سے نچلے درجہ پر تھانے قائم کئے۔ چند تھانوں کے دائروں پر مشتمل تحصیل قائم کی۔ چند تحصیلوں کو ملا کر ضلع بنایا۔ چند ضلعوں پر مشتمل کمشنری قائم کی۔ اور چند کمشنریوں کو ایک تنظیم کے رشتہ میں پرو کر اس کا نام صوبہ رکھ دیا۔ اس طرح ملک، محض تنظیمی ڈھانچے کے طور پر مختلف صوبوں میں بٹ گیا۔ ان صوبوں کی بنیاد نہ کوئی ابدی صداقت تھی، نہ ان کا کوئی خارجی وجود۔ محض انتظامی سہولت کی خاطر نقشہ پر کھینچی ہوئی چند لکیریں تھیں۔ اور یہ لکیریں انتظامی مقاصد کے پیش نظر ادلتی بدلتی رہتی تھیں۔ سنہ ۱۹۰۲ء تک، موجودہ سرحد کا الگ تشخص نہیں تھا۔ وہ صوبہ پنجاب ہی کا حصہ تھا۔ سنہ ۱۹۳۵ء تک، سندھ، صوبہ بمبئی کا ایک حصہ تھا۔ بلوچستان تو چند دن ہوئے جب الگ صوبہ بنایا گیا ہے۔ لیکن یہ طرفہ تماشا ہے کہ انگریز کی حکومت تک جن صوبوں کی یہ اصل و حقیقت تھی اب انہی صوبائی لکیروں کو قوم میں تفرقہ کی مستقل بنیادیں بنایا جا رہا ہے۔ انگریز کی عملداری میں ان صوبوں میں بسنے والوں نے کبھی یہ دعوی نہیں کیا تھا کہ وہ الگ الگ قومیں ہیں۔ لیکن اب یہاں چار صوبوں کی بنا پر چار الگ الگ قوموں کا تصور پیدا کیا جا رہا ہے۔ اور اعتراض سے بچنے کی خاطر، انہیں قومیں نہیں بلکہ قومیتیں کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یاد رکھئے، یہ قومیت کی اصطلاح محض فریب دہی ہے۔ ان میں عملاً کوئی فرق نہیں جو حیثیت ایک قوم کی ہوتی ہے وہی حیثیت ان قومیتوں کو دی جا رہی ہے عصرِ حاضر کی سیاسی تنظیم میں، ایک الگ قوم کے لئے الگ مملکت کا وجود ناگزیر ہوتا ہے۔ ہم نے اپنے لئے الگ مملکت (پاکستان) کا دعوی اسی بنیاد پر کیا تھا کہ ہم ایک الگ قوم ہیں۔ یہاں چار قومیتوں کی جو تفریق کی جا رہی ہے تو جس وقت اس تفریق کو تسلیم کر لیا گیا، چار جداگانہ مملکتوں کا دعوی مسلم ہو جائے گا۔ اس دعوت کا آغاز ایک اور نگاہ فریب اصطلاح سے کیا جاتا ہے جسے "صوبجاتی خود مختاری" کہا جاتا ہے۔ ذرا اس لفظ "خود مختاری" جسے انگریزی زبان میں اٹانومی یا "سیلف ڈیٹرمی نیشن" کہا جاتا ہے، پر غور کیجئے۔ "خود مختار" کے معنی ہوئے وہ جسے اپنے معاملات طے کرنے کا پورا پورا اختیار حاصل ہو۔ اس قسم کا اختیار مملکت کو تو حاصل ہو سکتا ہے، مملکت کی انتظامی وحدتوں کو کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ مغربی بساطِ سیاست کے مہرہ بازوں نے جب اپنے محکوم ممالک کو آزادی دی تو آتے آتے وہاں کچھ ایسے بیج بو آئے جن سے، ان ممالک میں اندرونی استحکام پیدا ہی نہ ہو سکے۔ انہی میں ایک تصور "صوبجاتی خود مختاری" کا بھی ہے۔ مملکت، صوبوں کے اس مطالبہ کو مسترد نہیں کر سکتی کیونکہ یہ مطالبہ نظامِ جمہوریت کا لازمی جزو سمجھا جاتا ہے۔ اور انہیں اس قسم کے اختیارات دے بھی نہیں سکتی کہ اس سے خود مملکت کا وجود خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ لہذا،

یہ مسئلہ مملکت اور اس کے صوبوں میں مستقل نزاع اور مخاصمت کا موجب بنا رہتا ہے اور اس طرح اس مملکت کا استحکام ختم ہو جاتا ہے۔ ہمارا چھوٹا سا ملک ہے جو اس وقت چار صوبوں میں بٹا ہوا ہے، اور مزید صوبے متشکل کرنے کے مطالبات بھی آئے دن پیش ہوتے رہتے ہیں۔ "صوبجاتی خود مختاری" کی بنیاد پر مرکز اور صوبوں کے درمیان، اور پھر مختلف صوبوں کے مابین، جس قسم کا تزاحم و تخاصم اس وقت رونما ہو رہا ہے اس نے مملکت کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ ون یونٹ کا قیام، وحدتِ مملکت کے بلند مقصد کی طرف ایک اچھا اقدام تھا لیکن چونکہ اس کے بعد ملک میں وحدتِ امت پیدا کرنے کے لئے کچھ نہ کیا گیا، اور نہ ہی مرکز سے دور علاقوں میں رہنے والوں کے لئے انتظامی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں اس لئے اس سے بے اطمینانی بہت زیادہ بڑھ گئی۔ اس کا علاج ان نقائص کا دور کرنا تھا۔ لیکن اس درد سر کو کون مول لیتا۔ عافیت اسی میں سمجھی گئی کہ اسے سرے سے ختم ہی کر دیا جائے۔ اسے ختم کیا تو صوبے پھر سے وجود میں آ گئے اور انہوں نے خود مختاری کے مطالبات شروع کر دیئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک عملاً ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے۔ یہاں ایک قوم کی جگہ چار قومیتوں نے جنم لیا ہے اور ہر صوبہ اپنی خود مختاری کا مطالبہ کر رہا ہے۔

اسلامی مملکت میں تو خیر اس قسم کے مناقشوں اور رقابتوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کسی عام مملکت میں بھی اگر اس قسم کے باہمی تنازعات پیدا ہو جائیں تو وہ مملکت باقی نہیں رہ سکتی۔ مملکت پاکستان کو اگر باقی رکھنا مقصود ہے تو اس میں چار قومیتوں کے تصور اور صوبائی خود مختاری کے مطالبہ کو ختم کرنا ہوگا۔ ایک قوم کے اندر چار قومیتیں اور ایک مملکت کے اندر خود مختار وحدتیں، متضاد عناصر ہیں جو یکجا رہ نہیں سکتے۔ یہاں یا چار قومیتیں اور خود مختار وحدتیں رہ سکتی ہیں، یا ایک قوم اور ایک خود مختار مملکت۔ یہ فیصلہ یہاں کے رہنے والوں کے کرنے کا ہے کہ وہ ان میں سے کسے باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ اسلامی مملکت میں مختلف قومیتوں یا مختلف خود مختار وحدتوں کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں انتظامی مصالح کے پیش نظر مختلف دوائر قائم کئے جا سکتے ہیں لیکن ان کی حیثیت کمشنریوں کی سی ہو سکتی ہے۔ خود مختار صوبوں کی سی نہیں۔

۱۸۔ کلچر

الگ الگ قومیتوں کی بنیاد اس دعوے پر استوار کی جاتی ہے کہ یہاں مختلف کلچر ہیں اور ہر کلچر کا حامل گروہ ایک جداگانہ قومیت رکھتا ہے۔ کلچر کے متعلق اس سے زیادہ کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں کہ ــــ ہے یہ وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا ــــ۔
جو لوگ یہاں دن رات کلچر کلچر پکارتے رہتے ہیں آپ ان سے پوچھئے کہ کلچر ہوتا کیا ہے۔ اس کے جواب میں وہ ایسے مبہم الفاظ استعمال کئے جائیں گے اور ایسی بھانت بھانت کی بولیاں بولیں گے کہ آپ محوِ حیرت رہ جائیں گے۔ سمٹ سمٹا کر بات، موسیقی۔ رقص۔ ڈرامہ وغیرہ پر آ جائے گی۔ اکثر مغربی دانشور مجھے ملنے کے لئے آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "پاکستان کلچر" کے الفاظ سن سن کر ہمارے کان پک گئے اور بالآخر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہمیں خود جا کر دیکھنا چاہیئے کہ وہ کلچر ہے کیا؟ ہم ہندوستان سے ہوتے ہوئے یہاں آئے۔ پہلے وہاں کا کلچر دیکھا جسے انہوں نے موسیقی۔ رقص۔ ڈرامہ وغیرہ کے رنگ میں پیش کیا۔ ہم یہاں آئے تو انہوں نے بھی اپنے کلچر کے مظاہر موسیقی۔ رقص۔ ڈرامہ کی شکل میں پیش کئے جو بعینہ وہی تھے جنہیں ہم بھارت میں دیکھ آئے تھے اس فرق کے ساتھ کہ وہاں ان کا معیار یہاں کے مقابلہ میں بلند تھا۔ پھر یہ پاکستانی حضرات ہمیں موہن جوڈارو، ہڑپا اور ٹیکسلا لے گئے کہ وہاں پاکستانی کلچر کے مظاہر دکھلائے جائیں۔ وہاں ہم نے جو کچھ دیکھا وہ وہی تھا جو ہم ہندوستان کے عجائب گھروں میں دیکھ آئے تھے۔ یہ کچھ کہنے کے بعد یہ دانشور مجھ سے پوچھا کرتے ہیں کہ ہمیں بتلایئے کہ اسلامی کلچر کیا ہے اور اس کے بعد یہ کہ پاکستانی کلچر کونسا ہے۔ آپ، برادرانِ عزیز! پاکستانی کلچر کے ان مدعیوں سے کہیئے کہ وہ دانشورانِ مغرب کے اس سوال کا جواب دیں اور بتائیں کہ پاکستانی کلچر کونسا ہے، اور اس کے بعد یہ کہ آپ جو پاکستان کی مختلف قومیتوں کا مختلف کلچر بتاتے ہیں، اس کلچر کی نوعیت کیا ہے؟

پہلے تو اس حقیقت کو یاد رکھیئے کہ کلچر کا جو تصور عام طور پر پیش کیا جاتا ہے اس کی رو سے اسلامی کلچر کوئی شے نہیں۔ اسلام زندگی کی مختلف اقدار اور غیر متبدل اصول دیتا ہے اور ان کی پابندی کو وہ اسلامی نہج زندگی قرار دیتا ہے۔ ان اقدار اور اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے، ہر ملک کے باشندوں کو آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ جس قسم کا رہن سہن چاہیں اختیار کریں۔ یہ انداز بود و ماند مختلف ممالک کے مسلمانوں کا مختلف ہو سکتا ہے۔ اگر اس کا نام کلچر ہے تو اسے اسلامی کلچر نہیں کہا جا سکے گا۔ البتہ اگر یہ کہا جائے کہ جن فنون لطیفہ یا ادب وغیرہ میں اسلامی اقدار کی روح جھلکتی نظر آ جائے، انہیں اسلامی کلچر کا مظہر قرار دیا جائے گا، تو اس قسم کا کلچر بہ حیثیتِ مجموعی آج کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ اسلامی اقدار کی روح، اثباتِ حیات (SAYING YES TO LIFE) ہے اور یہ روح، مذہب میں آ کر مفلوج بلکہ مصلوب ہو جاتی ہے۔ لہذا جب تک اسلام، پھر سے دین کی شکل اختیار نہیں کرتا، اسلامی اقدار کی روح کی نمو نہیں ہو سکتی۔ باقی رہے موہن جوڈارو، ہڑپا یا ٹیکسلا،

سو اتفاق سے یہ علاقے پاکستان کی حدود کے اندر آگئے ہیں۔ ان کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ لہذا انہیں پاکستانی کلچر کا مظہر قرار دینا حقیقت کا منہ چڑانا ہے۔ تقسیم کے نتیجہ میں اگر وہ بھارت کی حدود کے اندر چلے جاتے، تو ان کا کلچر، بھارتی کلچر قرار پا جاتا۔

بہرحال، کہہ یہ رہا تھا کہ پاکستان کے مختلف علاقوں میں رہنے والوں کے انداز بود و ماند کو کلچر قرار دینا۔ پھر کلچروں کے اس اختلاف کی بنیاد پر انہیں مختلف قومیتوں میں تقسیم کرنا۔ اور پھر ہر قومیت کا الگ الگ وجود تسلیم کرانا، پاکستان میں کشمکش، انتشار اور اختلاف اور فساد بپا کرانے کی بڑی گہری اور خطرناک سازش ہے جس کے پیچھے جذبہ محرکہ یہی ہے کہ اس مملکت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔

آپ اسلامی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہتے ہیں تو طرز بود و ماند تو ایک طرف، وہ خون، رنگ، نسل، زبان، وطن کے اختلاف کی بنا پر بھی امت میں کسی قسم کی تفریق کی اجازت نہیں دیتا۔ وہاں، عشرتِ قطرہ دریا میں جذب ہو جانے کا نام ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے، قرآن کریم نے شعوب اور قبائل (خاندانوں اور قبیلوں) کو وجہ تعارف قرار دیا تھا کیونکہ اس زمانے میں، بالخصوص صحرا نشینوں کی زندگی میں، باہمی تعارف کی کوئی اور علامت نہیں تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ دیکھنا! یہ قبائلی اور خاندانی تعارف کہیں وجہ تکریم اور باعثِ تفریق نہ بن جائے۔ اب اگر انہی علاقائی علامات اور ان کے انداز بود و ماند کو کلچر کی اصطلاح سے تعبیر کر کے، امت میں تفریق پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی، تو میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ زمانہ قبل از اسلام کے بتوں کو از سر نو حریم کعبہ میں لا کر بٹھانے کے مرادف ہوگا۔ یاد رکھیے۔ صبغۃ اللہ (اللہ کا رنگ) اپنی انفرادی طور پر اپنی ذات میں، اور اجتماعی طور پر معاشرہ میں صفاتِ خداوندی کی (علیٰ حدِ بشریت) نمود مسلمانوں کا کلچر ہوتا ہے۔ اسلام ان کی قومیت، اور تمام روئے زمین ان کا وطن۔ وَذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔

حرفِ آخر

یہ ہیں، عزیزانِ من! چند ایک مثالیں ان اصطلاحات کی جنہیں ہم مسلسل اور متواتر استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں لیکن جن کا متعین مفہوم اور عملی مقصود کسی کے سامنے نہیں۔ نتیجہ اس کا وہ ذہنی انتشار اور عملی خلفشار ہے جس میں قوم اس بری طرح سے گرفتار ہے اور جو ہمیں دن بدن تباہی کے جہنم کی طرف کشاں کشاں لیئے جا رہا ہے۔ ان اصطلاحات کے جو مفاہیم میں نے پیش کئے ہیں، وہ ایسے واضح ہیں کہ ان کا سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ لیکن ان کے سمجھنے کے لئے ایک شرط ہے۔ اور وہ یہ کہ پہلے ذہن کو ان تصورات اور مفاہیم سے خالی کر لیا جائے جو ہمارے ہاں متوارث چلے آ رہے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیئے

جب تک ذہن کے بتکدہ تصورات کو ان اصنام سے پاک و صاف نہیں کیا جائے گا، صحیح اسلامی تصورات اس میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔ پھر اقبالؒ ہی کے الفاظ میں

کھو دیا گیا جو مطلب ہفتاد و دو ملت میں
سمجھے گا نہ تو جب تک بے رنگ نہ ہو ادراک

جب تک بے رنگی ادراک کے بعد ان مفاہیم کو سمجھا نہیں جائے گا، وحدتِ فکر پیدا نہیں ہو سکے گی۔ اور جب تک وحدتِ فکر پیدا نہیں ہوگی نہ امت میں وحدت پیدا ہو سکے گی؛ نہ (پاکستان میں تو ایک طرف) مسلمانوں کے کسی ملک میں اسلامی مملکت کی تشکیل کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے گا

وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ شَهِيْد

والسلام

شاہد عادل

تفہیم القرآن جلد دوم پر ایک نظر

مودودی صاحب

اگر یہ تفسیر ہے تو معلوم نہیں تحریف کسے کہا جائیگا؟

قارئین تفہیم القرآن جلد اول پر تبصرہ پچھلے شمارے میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اب دوسری جلد پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ واضح رہے کہ راقم اختصار کو مدِنظر رکھتے ہوئے صرف انہی مقامات کو سامنے لا رہا ہے جن میں مودودی صاحب کی تضاد بیانی سنگین نوعیت کی ہے۔ ورنہ اس کے لئے تو (جیسا کہ طلوعِ اسلام نے کہا ہے) ایک پوری کتاب کی ضرورت ہے۔

داعیٔ حق کی صفات

اس تبصرے کی ابتداء ہم ایسے عنوان سے کر رہے ہیں کہ جس کا دعویٰ مودودی صاحب خود اپنے لئے بھی کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ہمیشہ ایک داعیٔ حق کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ ایک داعیٔ حق میں کونسی صفات ہونی چاہئیں، اس کے متعلق وہ اپنی تفسیر تفہیم القرآن جلد دوم (طبع دوم) کے صفحہ ۱۱۱ پر فرماتے ہیں۔

> داعیٔ حق کے لئے جو صفات سب سے زیادہ ضروری ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے نرم خو، متحمل اور عالی ظرف ہونا چاہئیے۔ اس کو اپنے ساتھیوں کے لئے شفیق، عامۃ الناس کے لئے رحیم اور اپنے مخالفوں کے لئے حلیم ہونا چاہئیے۔ اس کو اپنے رفقار کی کمزوریوں کو بھی برداشت کرنا چاہئیے اور اپنے مخالفین کی سختیوں کو بھی۔ اسے شدید اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے مزاج کو ٹھنڈا کرنا چاہئیے۔ نہایت ناگوار باتوں کو بھی عالی ظرفی کے ساتھ ٹال دینا چاہئیے۔ مخالفوں کی طرف سے کیسی ہی سخت کلامی، بہتان تراشی، ایذا رسانی اور شریرانہ مزاحمت کا اظہار ہو، اس کو درگذر ہی سے کام لینا چاہئیے۔

جماعت اسلامی والے ہمیشہ یہ دعویٰ کرتے رہتے ہیں کہ مودودی صاحب میں یہ صفات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں، لیکن قارئین اسی تفسیر کی جلد اول کے تبصرے میں ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ بہتان تراشی، ایذا رسانی اور شریرانہ مزاحمت تو کجا، اپنے سے ہلکا سا علمی اختلاف رکھنے والوں کو وہ تفسیر جیسی سنجیدہ کتاب میں بار بار "شیطان" کے "شاگرد" کے لقب سے نوازتے ہیں۔ ہم نے اسے ہلکا سا علمی اختلاف اس لئے کہا ہے کہ (مثلاً) عورتوں کو مردانہ عہدے دلانے

وغیرہ پر دوسروں کو مطعون کرتے رہے لیکن بعد میں جب اپنے آپ کو ضرورت پیش آئی تو اس کا شرعی جواز ڈھونڈ نکالا۔ مخالفوں کو "شیطان کے شاگرد" قرار دیتے ہیں جو کسر باقی رہ گئی تھی۔ اس کی تلافی وہ اس جلد میں اس وقت کے تمام پاکستانی حکمرانوں کو "جھوٹے، بے ایمان اور بے حیا" کی گالی دے کر کرتے ہیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں سے شادی بیاہ حرام

کشمیر میں جہاد کو حرام قرار دینے پر مودودی صاحب کے خلاف مخالفت کا جو طوفان اٹھا تھا وہ ابھی تھما نہیں تھا کہ ان کے خلاف اخباروں میں ایک اور بحث چل نکلی کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں سے شادی بیاہ حرام قرار دیتے ہیں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب راقم کو مودودی صاحب سے کچھ عقیدت تھی۔ اسلئے ان کے تمام عقیدت مندوں کی طرح اس بحث کو مخالفین کا ایک افترا سمجھا[1]۔ اور اس کی طرف کوئی خاص دھیان نہ دیا۔ لیکن اب جو ان کی تفسیر کا غور سے مطالعہ کیا تو ان کا یہ فتویٰ اس میں بھی سامنے آگیا۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:-

"پس یہ آیت دستوری و سیاسی ولایت کو ریاست کے ارضی حدود تک محدود کر دیتی ہے اور ان حدود سے باہر کے مسلمانوں کو اس مخصوص رشتہ سے خارج قرار دیتی ہے۔ اس عدمِ ولایت کے قانونی نتائج بہت وسیع ہیں جن کی تفصیلات بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ مثال کے طور پر صرف اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ اس عدمِ ولایت کی بنا پر دارالکفر اور دارالاسلام کے مسلمان ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کے قانونی ولی نہیں بن سکتے، باہم شادی بیاہ نہیں کر سکتے اور اسلامی حکومت کسی ایسے مسلمان کو اپنے ہاں ذمہ داری کا منصب نہیں دے سکتی جس نے دارالکفر سے شہریت کا تعلق نہ توڑا ہو۔

علاوہ بریں یہ آیت اسلامی حکومت کی خارجی سیاست پر بھی بڑا اثر ڈالتی ہے۔ اس کی رُو سے دولتِ اسلامیہ کی ذمہ داری اُن مسلمانوں تک محدود ہے جو اس کی حدود کے اندر رہتے ہیں۔ باہر کے مسلمانوں کے لئے کسی ذمہ داری کا بار اس کے سر نہیں ہے۔" (صفحہ ۱۶۱)

اس طرح کروڑوں مسلمانوں کو ہندوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے لئے وہ ایک ایسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ جس کا اس مسئلے سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں اَنَا بَرِیٌٔ مِن کُلِّ مُسلِمٍ بَیْنَ ظَھْرِ المُشْرِکِیْنَ۔ (میں کسی ایسے مسلمان کی حمایت و حفاظت کا ذمہ دار نہیں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو)

ایک معمولی فہم کا آدمی بھی اس حقیقت کو بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ اس حدیث میں مشرکین عرب مراد ہیں جن کو صلعم نے ان کے درمیان رہنے والے مسلمانوں کو دارالاسلام کی طرف ہجرت کا حکم دیا تھا۔ اور جن مسلمانوں نے اس حکم کی تعمیل نہ کی ان کے متعلق آپ نے یہ فرمایا۔ مزید یہ کہ خود آیت زیرِ بحث کے الفاظ بھی یہی ہیں وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا وَ لَمْ یُھَاجِرُوْا۔ یعنی وہ لوگ جو ایمان تو لائے لیکن دارالاسلام کی طرف ہجرت نہیں کی۔ ہندوستان اور دوسرے

---

[1] یہ عقیدت مندی کا نتیجہ تھا۔ ورنہ مودودی صاحب نے غیر مبہم الفاظ میں لکھا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں سے شادی بیاہ حرام ہے۔ (طلوعِ اسلام)

غیر مسلم ممالک میں رہنے والے بیس پچیس کروڑ مسلمانوں کے خلاف مودودی صاحب کا یہ استدلال اس وقت صحیح سمجھا جا سکتا تھا جب ان تمام مسلمانوں کو دار الاسلام کے مسلمان اپنے ہاں ہجرت کی دعوت دیتے اور وہ ہجرت کرنے سے انکار کر دیتے۔ اس کے برعکس حقیقت حال یہ ہے کہ دیگر مسلم ملکتیں تو ایک طرف خود مودودی صاحب کی تصریح کے مطابق دنیا کی واحد اسلامی حکومت یعنی سعودی عرب اتنے مسلمانوں کو بھی اپنے ہاں ہجرت کی اجازت نہیں دیتی جتنی امریکہ جیسی غیر مسلم حکومت ہر سال دے رہی ہے۔ اس کے بعد غور فرمائیے کہ وہ کونسی شرعی دلیل ہے جس کی بنا پر ان سے شادی بیاہ حرام اور انہیں غیر مسلموں کے رحم و کرم پر چھوڑا جا رہا ہے۔

جہادِ کشمیر کی حرمت کے غلط فتویٰ کی قرآنی تائید

قارئین سوچتے ہوں گے کہ ایسی کونسی ہنگامی صورتِ حالات پیدا ہو گئی تھی کہ مودودی صاحب ایک غیر متعلق سے مسئلہ کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں کہ ہندوستان اور دوسرے غیر مسلم ممالک میں رہنے والے کروڑوں مسلمانوں سے شادی بیاہ حرام اور انہیں کلی طور پر غیر مسلموں کے رحم و کرم پر چھوڑ رہے ہیں۔ اس کا تعلق دراصل ان کے جھوٹے جذبۂ انانیت سے ہے۔ صورت یوں ہوئی کہ جب قیامِ پاکستان کے بعد ہندوستان نے زبردستی کشمیر کو بھارت میں شامل کر لیا تو اہلِ کشمیر نے ہندوستان کے خلاف مسلح بغاوت کر دی۔ اہلِ پاکستان بھی اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کے لئے پہنچے۔ مودودی صاحب نے فرمایا کہ حکومتِ ہندوستان سے ہمارے معاہدانہ تعلقات ہیں۔ اس لئے کشمیر کا موجودہ جہاد اسلامی شرائط پر پورا نہیں اترتا۔ لہٰذا جائز نہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو دلیل دی تھی وہ ان کی تفسیر کی اس بحث میں بھی موجود ہے جس کا ایک اقتباس ہم اوپر نقل کر چکے ہیں اور جس کے آخر میں وہ فرماتے ہیں:۔

> اگر ظلم کرنے والی قوم سے دار الاسلام کے معاہدانہ تعلقات ہوں تو اس صورت میں مظلوم مسلمانوں کی کوئی ایسی مدد نہیں کی جا سکے گی جو ان تعلقات کی اخلاقی ذمہ داریوں کے خلاف پڑتی ہو۔ (صفحہ ۱۷۲)

علماء نے مولانا شبیر احمد عثمانی ؒ کی سرکردگی میں مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کو آڑے ہاتھوں لیا اور جوابی فتاویٰ شائع کئے۔ اس غلط فتوے نے جماعت اسلامی کی ساکھ کو کس حد تک مجروح کیا تھا اس کا اندازہ لگانے کے لئے اتنا دیکھ لینا کافی ہو گا کہ جماعتِ اسلامی ابھی تک تاویلات کے چکر میں پڑی ہوئی ہے اور ان کا انہوں سے خلاصی نہیں پا سکی کیونکہ اس کی جو تاویل بھی کی گئی اس میں سے اصل حقیقت نے کسی نہ کسی صورت میں اپنا سر نکال لیا۔ اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم جماعتِ اسلامی ہی کی ایک دو تاویلات نقل کرتے ہیں جن سے حقیقتِ حال خود بخود واضح ہو جائے گی۔

جہادِ کشمیر کے فتوے کے بارے میں جماعت اسلامی کی وضاحت

اس فتوے کی وجہ سے جب جماعت اسلامی والوں کے لئے سانس لینا مشکل ہو گیا تو جماعت کی مجلس شوریٰ کا ایک ہنگامی اجلاس ہوا جس میں اس فتوے کے بارے میں یہ وضاحت پیش کی گئی:۔

"یہ کوئی فتویٰ نہیں تھا بلکہ امیر جماعت اسلامی کی فقہی رائے تھی۔" (ترجمان القرآن۔ بابت ستمبر ۱۹۴۸ء، ص ۳۲۹)

کیسی ابلہ فریب تاویل ہے کہ فتویٰ نہیں فقہی رائے تھی۔ اگر ان دونوں کے درمیان کوئی امتیازی فرق ہے تو جماعت اسلامی کو اسے بھی واضح کر دینا چاہیئے تھا۔ بہرحال یہ فتویٰ تھا یا فقہی رائے، جماعت اسلامی نے اس وضاحت کی آڑ لیتے ہوئے جس جہاد کشمیر کو مودودی صاحب نے ناجائز قرار دیا تھا اس کے جواز کی راہ نکال لی۔ اس تاویل کو جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کی زبانی ہی سنیئے:۔

امیر جماعت نے اپنے پچھلے بیانات میں جو شرعی مسئلہ بیان کیا تھا۔ وہ اس حالت سے متعلق تھا جبکہ سرکاری طور پر اس امر کا کوئی اقرار و اظہار نہیں ہوا تھا۔ کہ پاکستان کی فوجیں حدودِ کشمیر میں موجود ہیں۔ اب ۷ ستمبر کو مجلس اقوام متحدہ کے کشمیر کمیشن سے حکومت پاکستان کی جو مراسلت شائع ہوئی ہے اور وزیر خارجہ پاکستان نے ۸ ستمبر کو جو بیان دیا ہے اس میں اس امر واقعہ کا اظہار و اقرار موجود ہے اور حکومت ہند بھی اس پر مطلع ہو چکی ہے۔ لہٰذا اب چونکہ معاملہ کی نوعیت بدل گئی ہے اور اس بنا پر اس کا شرعی حکم بھی وہ نہیں ہوگا جو پہلے تھا۔ اس لئے مجلس شوریٰ کی متفقہ رائے یہ ہے کہ اب معاہدانہ تعلقات کے باوجود اہل پاکستان کے لئے جہاد کشمیر میں جنگی حصہ لینا بالکل جائز ہے۔ (ایضاً)

دیکھئے جماعت اسلامی کی اس تاویل سے جہاد کشمیر کی حرمت کا فتویٰ کس بُری طرح جھانک رہا ہے۔ یعنی اس سے پہلے اس میں حصہ لینا ناجائز تھا اور جو مسلمان اس کے لئے جانیں قربان کر چکے تھے ان کے لئے درجۂ شہادت نصیب ہونا تو کجا وہ الٹا ایک ناجائز کام کے ارتکاب کے مجرم بنتے ہیں۔

مرتد کی سزا قتل ہے

یہ مسئلہ اس جلد کے اہم مسائل میں سے ہے اور بہت سے مقامات پر اس کا بیان ہوا ہے۔ ہمارے ہاں ارتداد کا سادہ سا مفہوم یہ ہے کہ کسی مسلمان کا اپنے مذہب کو ترک کر کے کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لینا۔ مودودی صاحب ایسے شخص کو واجب القتل قرار دیتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس اصول کو تسلیم کر لینے کے بعد ہوتا کیا ہے؟ یہ کہ اس کی آڑ لے کر کسی بھی مخالف پر کفر کا فتویٰ ٹھونپ کر اسے قتل کیا جا سکتا ہے۔ اور کفر کا فتویٰ تو ہمارے ہاں سب سے سستی چیز ہے۔ اس کی سنگینی کا اس وقت تک اندازہ نہیں ہو سکیگا جب تک ہم اس بارے میں مودودی صاحب کا مسلک انہی کے الفاظ میں نقل نہ کر دیں۔ جس اقامت دین کے مودودی صاحب داعی ہیں۔ اگر (خدا نکردہ) وہ کبھی یہاں نافذ ہو گیا تو اس کے بعد مودودی صاحب یہاں کے مسلمانوں سے کس طرح نپٹیں گے یہ خود ان کی زبانی سنیئے:۔

میرے نزدیک اس کا حل یہ ہے۔ واللہ الموافق للصواب۔ کہ جس علاقے میں اسلامی انقلاب رونما ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً و عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں۔ وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے اجتماعی نظام سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان سب

لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوتے ہیں مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانین اسلامی ان پر نافذ کئے جائینگے فرائض و واجبات دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا۔ اور پھر جو کوئی دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھے گا۔ اسے قتل کر دیا جائے گا۔

(مرتد کی سزا - از مودودی صفحہ ۷۶)

مودودی صاحب کا یہ مسلک قرآن و سنت اور فقہاء کے فیصلوں کے سراسر خلاف ہے۔ لیکن وہ اس مقصد کے لئے تفہیم القرآن کی اس جلد میں بار بار غیر متعلق آیات قرآنی کو کھینچ تان کر غلط استدلال کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً سورہ توبہ کی آیت فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

یعنی اگر وہ کفر و شرک سے باز آجائیں اور اسلام قبول کر کے نماز و زکوٰۃ کی پابندی اختیار کر لیں یا بالفاظ دیگر اسلامی نظامِ زندگی میں جذب ہو جائیں تو پھر ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ اسی آیت سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فتنۂ ارتداد کے زمانہ میں استدلال کیا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جن لوگوں نے فتنہ برپا کیا تھا ان میں سے ایک گروہ کہتا تھا کہ ہم اسلام کے منکر نہیں ہیں۔ نماز بھی پڑھنے کے لئے تیار ہیں مگر زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ صحابہ کرام کو بالعموم یہ پریشانی لاحق تھی کہ آخر ایسے لوگوں کے خلاف آواز کیسے اٹھائی جا سکتی ہے۔ مگر حضرت ابوبکرؓ نے اسی آیت کا حوالہ دے کر فرمایا کہ ہمیں تو ان لوگوں کے چھوڑ دینے کا حکم صرف اس صورت میں دیا گیا تھا جبکہ یہ شرک سے توبہ کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ مگر جب یہ تین شرطوں میں سے ایک شرط اڑا دیتے ہیں تو پھر انہیں ہم کیسے چھوڑ دیں۔ (صفحہ ۱۷۷)

حضرت ابوبکرؓ پر افتراء

یہ آیت جیسا کہ اس کے واضح الفاظ ہیں مشرکین مکہ کے بارے میں ہے۔ لیکن مودودی صاحب کھینچ تان کر اس سے مرتد کا قتل کرنا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ مودودی صاحب کا یہ فرمانا کہ حضرت ابوبکرؓ نے فتنۂ ارتداد میں اس آیت سے استدلال فرمایا تھا ہمارے لئے باعث حیرت تھا۔ کیونکہ مرتدین کے بارے میں قرآن مجید میں ایک جگہ نہیں بلکہ پورے چھ مقامات پر واضح احکام موجود ہیں۔ طبیعت نہیں مانتی تھی کہ حضرت ابوبکرؓ جنہوں نے رسول اللہ صلعم سے براہ راست تربیت حاصل کی تھی ایک غیر متعلقہ آیت سے استدلال فرمائیں۔ اب مصیبت یہ تھی کہ مودودی صاحب نے اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا تھا۔ چنانچہ ہم نے اس حوالہ کی تلاش کے لئے اپنی سی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ پھر معاً اس موضوع پر مودودی صاحب کی مستقل کتاب "مرتد کی سزا" پر نظر پڑ گئی کہ اتنا اہم حوالہ اس میں ضرور دیا گیا ہوگا۔ لیکن جب ہم نے اس کی ورق گردانی کی تو عجیب حقیقت سامنے آئی کہ حضرت ابوبکرؓ کا اس آیت سے استدلال کرنا تو کجا خود مودودی صاحب کو اپنے غلط مسلک کی تائید کے لئے سارے قرآن مجید سے کوئی یقینی حوالہ نہیں مل سکا۔ اسے وہ اپنی جز نلزم کی زبان میں یوں گول مول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بعض لوگ حدیث اور فقہ کی باتیں سنکر یہ سوال کیا کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں یہ سزا کہاں لکھی ہے

ایسے لوگوں کی تسلی کے لئے اگرچہ ہم نے اس بحث کے ابتدا میں قرآن کا حکم بھی بیان کر دیا ہے لیکن اگر بالفرض یہ حکم قرآن میں نہ بھی ہوتا تو حدیث کی کثیر التعداد روایات، خلفائے راشدین کے فیصلوں کی نظیریں اور فقہاء کی متفقہ رائیں اس حکم کو ثابت کرنے کے لئے کافی تھیں۔ ثبوت حکم کے لئے ان چیزوں کو ناکافی سمجھ کر جو لوگ اس کا حوالہ قرآن سے مانگتے ہیں ان سے ہمارا یہ سوال ہے کہ تمہاری رائے میں کیا اسلام کا پورا قانون تعزیرات وہی ہے جو قرآن میں بیان ہوا ہے۔ (مرتد کی سزا۔ صفحہ ۳۱)

احادیث میں جس مرتد کو قتل کرنے کا حکم ہے وہ وہ شخص ہے جو مرتد ہونے کے بعد مسلمانوں سے جنگ کرے۔ رَجُلٌ يَخْرُجُ مِنَ الْاِسلام فيحارب الله عزّ وجلّ و رسوله۔ حضرت ابوبکرؓ نے جن مرتدین کے خلاف چڑھائی کی تھی ان کا جرم یہی نہیں تھا کہ انہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ حضور صلعم کی وفات کی خبر سنتے ہی ان لوگوں نے اپنے ہاں کے مسلمانوں کو قتل کر دیا تھا۔ فَوَثَبَ بنو ذبيان وعبس على من فيهم من المسلمين و فعل ذٰلك غيرهم من المرتدين۔ (تاریخ ابن خلدون۔ جلد ۲۔ صفحہ ۶۶)۔ (ترجمہ) رسول اللہ کی وفات کی خبر سنتے ہی قبیلہ بنو ذبیان اور عبس نے اپنے اپنے قبیلوں کے بقیہ مسلمانوں پر (جنہوں نے ان کے ساتھ مرتد ہونے سے انکار کر دیا تھا) پل پڑے اور انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دوسرے مرتدین نے بھی اپنے اپنے قبیلے کے مسلمانوں کے ساتھ یہی سلوک کیا

یعنی اسلام سے پھر جانے کے ساتھ ہی مسلمانوں کے قتل کرنے کی وجہ سے وہ محارب اللہ و رسولہ کے بھی مرتکب ہو گئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے اسلامی لشکر کی تیاری سے پہلے مدینہ منورہ پر رات کے وقت چڑھائی بھی کر دی۔ فَمَا لبثوا الاّ ثلاثًا حتّٰى طرقوا المدينة غارةً مع الليل۔ (تاریخ طبری جلد ۴ صفحہ ۱۸۷۵) پس تین ہی دن گزرے تھے کہ انہوں نے رات کے وقت مدینہ منورہ پر چڑھائی کر دی۔

یہ تھا ان لوگوں کا وہ جرم جس کی بنا پر صدیق اکبرؓ نے ان کے خلاف جنگ کرنے کا فیصلہ فرمایا تھا۔ لیکن مودودی صاحب ہر مذہب بدلنے والے مسلمان کو قتل کرنے کے لئے احادیث میں محارب اللہ و رسولہ کے الفاظ کو سپر بنا رہے ہیں۔

قتل مرتد کیلئے قرآنِ مجید سے مودودی صاحب کا اپنا استدلال

مودودی صاحب مذہب تبدیل کرنے والے مرتد کو قتل کرنے کے لئے درجہ بدرجہ آگے بڑھتے ہیں۔ چنانچہ مشرکین سے متعلق آیت سے حضرت ابوبکرؓ کی زبانی اپنے غلط مسلک کی تائید حاصل کرنی چاہی۔ اور پھر اپنی تفسیر کے اگلے ہی صفحہ پر ایک دوسری آیت سے قسمت آزمائی کرتے ہیں۔ وان نكثوا ايمانهم من بعد عهدهم کی دور از کار تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اس آیت کے الفاظ سے بظاہر تو یہ گمان ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنے عہد توڑ دیں تو ان سے لڑو لیکن نظمِ کلام پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عہد سے مراد اسلام اور اطاعتِ امر کا عہد ہے کیونکہ معاہدات کو تو پہلے ہی ساقط کیا جا چکا تھا اور اب آئندہ ان سے کوئی معاہدہ کرنا سرے سے پیش نظر نہیں تھا لہٰذا یہاں خلاف ورزی معاہدہ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا پھر یہ

آیت اوپر والی آیت کے مابعد آئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اگر وہ توبہ کریں اور نماز و زکوٰۃ کی پابندی قبول کریں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ اس کے بعد یہ کہنا کہ اگر وہ اپنی قسمیں توڑ دیں صاف طور پر یہ معنی رکھتا ہے کہ اس سے مراد ان کا اسلام قبول کر لینے اور اسلامی نظامِ جماعت کی پابندی کا عہد کرنے کے بعد پھر اسے توڑ دینا ہے۔ دراصل اس آیت میں اس فتنۂ ارتداد کی طرف اشارہ ہے جو ڈیڑھ سال بعد خلافتِ صدیقی کی ابتدا میں برپا ہوا۔ (صفحہ ۱۷۹ - ۱۸۰)

اب بھی اگر قوم مودودی صاحب کی فہمِ قرآن کی داد نہ دے تو اس سے بڑھ کر ظلم کیا ہوگا؟ یعنی جو اشارہ خود رسول اللہ صلعم اور صحابہ کرامؓ اور تمام مفسرین قرآن مجید میں نہ پا سکے، اسے چودہ سو سال بعد جناب مودودی صاحب نے پالیا۔ صحابہ کرامؓ اور جملہ مفسرین نے اس آیت سے بالاتفاق کفار کی عہد شکنی مراد لی ہے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں۔

کل المفسرین حملوہ علی نقض العھد قال ابن عباس والسدی والکلبی نزلت فی کفار مکۃ نکثوا ایمانھم بعد عھدھم الحدیبیۃ واعانوا بنی بکر علی خزاعۃ وھذہ الآیۃ تدل علی ان قتال الناکثین اولی من قتال غیرھم من الکفار لیکون ذالک زجرًا لغیرھم۔ (تفسیر کبیر۔ جلد ۴ صفحہ ۴۰۲)

(ترجمہ) تمام مفسرین نے اس سے نقضِ عہد مراد لیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ، امام سدیؒ اور امام کلبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ آیت ان کفارِ مکہ کے متعلق نازل ہوئی ہے جنہوں نے حدیبیہ کے عہد کو توڑ ڈالا اور قبیلہ خزاعہ کے خلاف بنو بکر کی مدد کی۔ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عام کفار کی نسبت عہد توڑنے والے کفار سے جنگ کرنا زیادہ ضروری ہے کہ یہ دوسروں کے لئے باعثِ عبرت ہو۔

خود مودودی صاحب نے اس کا ترجمہ انہی مفسرین کی تفسیر کے مطابق کیا ہے (یعنی یہ کہ" اور اگر عہد کرنے کے بعد یہ پھر اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمہارے دین پر حملے کرنے شروع کر دیں تو کفر کے علمبرداروں سے جنگ کرو۔ کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں) جس طرح مودودی صاحب احادیث میں "حارب اللہ و رسولہ" کے الفاظ پر پردہ ڈال جاتے ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی "تمہارے دین پر حملے کرتے" کے الفاظ کو نظرانداز کر کے کفارِ مکہ کے بارے میں واضح آیت کو دین بدلنے والوں کو قتل کرنے کی طرف موڑ کر لے جاتے ہیں۔

عہدِ رسالتمآبؐ میں ارتداد

مودودی صاحب اگر احادیث کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے تو وہ بہت سی پریشانیوں اور الجھنوں سے بچ جاتے لیکن وہ صرف انڈکس دیکھ کر اپنے مطلب کی حدیث لے لیتے ہیں اور بس۔ اور ان کا یہی طرزِ عمل ان کے لئے مصیبت کا باعث بن جاتا ہے اور پھر وہ اپنے غلط سا مسلک کو صحیح ثابت کرنے کے لئے قرآنی آیات کی کھینچ تان شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً اسی مسئلہ میں اگر وہ تمام احادیث کا بغور مطالعہ فرماتے تو ان پر نصف النہار کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ واجب القتل صرف وہی مرتد ہیں جو ارتداد کے ساتھ حارب اللہ و رسولہ کے بھی مرتکب ہوں نہ کہ مجرد مرتد۔ خود حضور صلعم کے سامنے بعض لوگ مرتد ہوئے لیکن آپ نے انہیں قتل نہ کیا۔ اس بارے میں صحیح بخاری میں

کتاب الاحکام باب "من بایع ثم استقال البیعۃ" میں حضرت جابر بن عبداللہ کی وہ روایت کہ جس کے مطابق ایک شخص حضور صلعم کے سامنے مرتد ہوا لیکن آپ نے اسے قتل نہ کیا اور وہ مدینہ منورہ سے نکل گیا، دیکھ لینی کافی ہوگی۔

(۰)

جماعت اسلامی کیلئے زکوٰۃ لینے کا جواز

اسلام میں زکوٰۃ کا مسئلہ بڑا صاف ہے یعنی یہ اسلامی حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ امیروں سے "زکوٰۃ" وصول کرکے غریبوں کی بہبود پر خرچ کرے۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ اسلامی حکومت دورِ رسالت یا خلافت راشدہ کے مطابق ہو۔ خلافت راشدہ کے بعد جب مسلمان حکمران عیش پرست ہو گئے تھے تو پھر بھی صحابہ کرامؓ اور ائمہ عظام نے یہی فتویٰ دیا کہ زکوٰۃ جب تک حکومت کو ادا نہ کی جائے گی ادا نہ ہوگی جضرت عبداللہ بن عمرؓ نے تو یہاں تک فتویٰ دیا تھا کہ ادفعوھا الیھم وان شربوا الخمور۔ (نیل الاوطار۔ جلد ۴ صفحہ ۱۲۱) کہ زکوٰۃ انہی حکمرانوں کو دینی ہوگی چاہے وہ شرابی ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن مودودی صاحب اسے جماعت اسلامی کے لئے زکوٰۃ لینے کے لئے جائز قرار دینا چاہتے تھے۔ جو زیادہ تر خوش پوش لوگ تھے۔ اس کے لئے وہ پہلے یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ زکوٰۃ انفرادی معاملہ ہے۔ مثلاً وہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا بنی ہاشم آپس میں ایک دوسرے کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں یا نہیں؟ اس کے متعلق آپ نے امام ابو یوسف کی یہ رائے نقل کر دی کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں جبکہ دوسرے اسے جائز نہیں سمجھتے" (صفحہ ۲۰۶)

اس کے بعد اگلا قدم اٹھاتے ہیں اور اگلے ہی صفحہ پر اپنے مطلب کی بات کی طرف آ جاتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

> "راہِ خدا" کا لفظ عام ہے۔ تمام وہ نیکی کے کام جن میں اللہ کی رضا ہو اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس حکم کی رُو سے زکوٰۃ کا مال ہر قسم کے نیک کاموں میں صرف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حق یہ ہے اور ائمہ سلف کی بڑی اکثریت اس کی قائل ہے کہ یہاں فی سبیل اللہ سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے یعنی وہ جدوجہد جس سے مقصود نظام کفر کو مٹانا اور اس کی جگہ نظام اسلامی کو قائم کرنا ہے۔ اس جدوجہد میں جو لوگ کام کریں ان کو سفر خرچ کے لئے، سواری کے لئے، آلات و اسلحہ اور سروسامان کی فراہمی کے لئے زکوٰۃ سے مدد دی جا سکتی ہے خواہ وہ بجائے خود کھاتے پیتے لوگ ہوں اور اپنی ذاتی ضروریات کے لئے ان کو مدد کی ضرورت نہ ہو۔ (صفحہ ۲۰۷)

حالانکہ جو تفسیر بھی اٹھا کر دیکھئے اس میں "فی سبیل اللہ" سے مراد قتال فی سبیل اللہ لکھا ملے گا۔ دیکھئے جو رقم حکومت کی تحویل میں جاتی تھی، مودودی صاحب اپنی جماعت کے کھاتے پیتے لوگوں کے لئے اس کا جواز نکال رہے ہیں۔

(۰)

زاید مسجد بنانا احمقانہ مذہبیت ہے

تفسیر زیر تبصرہ میں "ضرورت سے زاید مساجد" کی تعمیر

کے بارے میں فرماتے ہیں :-

مدینہ میں اس وقت دو مسجدیں تھیں۔ ایک مسجد قُبا جو شہر کے مضافات میں تھی۔ دوسری مسجد نبوی جو شہر کے اندر تھی۔ ان دو مسجدوں کی موجودگی میں ایک تیسری مسجد بنانے کی ضرورت نہ تھی اور وہ زمانہ **ایسی احمقانہ مذہبیت** کا نہ تھا کہ مسجد کے نام سے ایک عمارت بنا دینا بجائے خود کارِ ثواب ہو۔ قطع نظر اس سے کہ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ بلکہ اس کے برعکس ایک نئی مسجد بننے کے معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کی جماعت میں خواہ مخواہ تفریق رونما ہو۔ جسے ایک صالح اسلامی نظام کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا۔ (صفحہ ۲۲۳)

اللہ کی شان ہے کہ مودودی صاحب نے جن کاموں پر دوسروں پر طعن کیا بعد میں خود ان کے مرتکب ہوئے۔ عورتوں کو مردوں کے مساوی عہدے دلانے والوں کو "شیطان کے شاگرد" کہا اور پھر ایک عورت کو ملک کا سب سے اعلیٰ انتظامی اور سیاسی عہدہ دلانے کے لئے تن من دھن سے کام کیا۔ زاید از ضرورت مسجد بنانے کو احمقانہ مذہبیت قرار دیا لیکن اب اس احمقانہ مذہبیت کے خود مرتکب ہو رہے ہیں۔ اور عوام سے اپیل کی جا رہی ہے کہ جماعتِ اسلامی کی مسجد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے پانچ لاکھ روپیہ چندہ دیں حالانکہ اس وقت لاہور کی ہزاروں مساجد نمازیوں کی عدم موجودگی یا کمی کی مرثیہ خواں ہیں۔ خود مرکز جماعتِ اسلامی کی قریب ترین مسجد (یعنی جامع مسجد محلہ رسولپورہ) کو گلہ ہے کہ جماعت کے مرکز سے قریب تر ہونے کے باوجود جماعتِ اسلامی سے متعلق کوئی صاحب وہاں نماز پڑھنے نہیں آتے۔ اور اس مسجد کی غیر آبادی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ وہ موجودہ حاضری سے پچاس گنا زیادہ نمازیوں کے لئے کافی ہے۔ (راقم عام طور پر اسی مسجد میں نماز ادا کرتا ہے)۔ سوچئے کہ جس معیار کے مطابق وہ مدینہ منورہ کی تیسری مسجد کی تعمیر غیر ضروری سمجھتے ہیں کیا لاہور کی ہزاروں غیر آباد مساجد کی موجودگی میں ان کا پانچ لاکھ روپے کی لاگت سے ایک نئی مسجد بنانا احمقانہ مذہبیت شمار نہیں ہوگا۔؟

(o)

موجودہ مذہبی تعلیم کے بنیادی نقائص

مودودی صاحب نے اپنی اس تفسیر میں سرخیاں قائم نہیں کیں۔ تاہم ایک مفصل انڈکس دیا ہے جس سے ان کی قائم کردہ سرخیاں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اور ہم نے کوشش کی ہے کہ زیادہ تر ایسی سرخیاں ہی دی جائیں جو خود ان کی اپنی قائم کردہ ہوں۔ چنانچہ انڈکس کے صفحہ ۷۱۱ کے شروع میں مذکورہ بالا سرخی دیتے ہیں اور پھر اپنی تفسیر کے صفحہ ۲۵۱ - ۲۵۲ پر اس کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں :-

اس آیت میں لفظ لیتفقھوا فی الدین جو استعمال ہوا ہے۔ اس سے بعد کے لوگوں میں ایک عجیب غلط فہمی پیدا ہو گئی جس کے زہریلے اثرات ایک مدت سے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم بلکہ ان کی مذہبی زندگی پر بھی بُری طرح چھائے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو تفقہ فی الدین کو تعلیم کا مقصود بتایا تھا۔ جس کے معنی ہیں دین کو سمجھنا۔ اس کے نظام میں بصیرت حاصل کرنا، اس کے مزاج اور اس کی روح سے آشنا ہونا۔ اور اس قابل ہو جانا کہ فکر و عمل کے ہر گوشے اور زندگی کے ہر شعبے میں انسان یہ جان سکے

کہ کون طریقِ فکر اور کون طرزِ عمل روحِ دین کے مطابق ہے لیکن آگے چل کر جو قانونی علم اصطلاحاً فقہ کے نام سے موسوم ہوا اور جو رفتہ رفتہ اسلامی زندگی کی محض صورت (بمقابلہ روح) کا تفصیلی علم بن کر رہ گیا۔ لوگوں نے اشتراکِ لفظی کی بنا پر سمجھ لیا کہ بس یہی وہ چیز ہے جس کا حاصل کرنا حکمِ الٰہی کے مطابق تعلیم کا منتہائے مقصود ہے، حالانکہ وہ کُل مقصود نہیں بلکہ محض ایک جزوِ مقصود تھا۔ اس عظیم الشان غلط فہمی سے جو نقصانات دین اور پیروانِ دین کو پہنچے ان کا جائزہ لینے کے لئے تو ایک کتاب کی وسعت درکار ہے، مگر یہاں ہم اس پر متنبہ کرنے کے لئے مختصراً اتنا اشارہ کئے دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کو جس چیز نے روحِ دین سے خالی کر کے محض جسمِ دین اور شکلِ دین کی تشریح پر مرتکز کر دیا اور بالآخر جس چیز کی بدولت مسلمانوں کی زندگی ایک نری بے جان ظاہرداری دینداری کی آخری منزل بن کر رہ گئی۔ وہ بڑی حد تک یہی غلط فہمی ہے۔

مودودی صاحب کی ایسی تحریریں پڑھ کر خوشی ہوتی ہے بشرطیکہ وہ یہ بات صدقِ دل سے کہتے ہوں۔ اسی مسئلہ زیرِ بحث یعنی ہماری مذہبی تعلیم کے نظام ہی کو لے لیجئے۔ اسے مروجہ اصطلاح میں "درسِ نظامی" کہا جاتا ہے۔ وہ اپنی تقریروں میں اس کے خلاف بہت کچھ فرماتے رہتے ہیں لیکن جب جماعتِ اسلامی کو اسی مذہبی تعلیم سے آراستہ مولوی حضرات کے تعاون کی ضرورت محسوس ہوئی، تو یہی نظام "ٹھوس قابلیت پیدا کرنے والا نظامِ تعلیم" بن گیا۔

درسِ نظامی ٹھوس قابلیت پیدا کرتا ہے

مودودی صاحب کے ترجمان رسالہ ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۶۷ء کے اداریہ (اشارات) میں ہمیں اس نظامِ تعلیم کے بارے میں یہ الفاظ ملتے ہیں:-

> مجھے قدیم اور جدید دونوں مدارس میں تھوڑی مدت پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے اور میں یہ بات بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ درسِ نظامی کا نصاب ٹھوس علمی قابلیت پیدا کرنے کے اعتبار سے جدید مدارس کے نصاب سے کہیں بہتر ہے۔ اس نصاب کو اگر اچھے طریقے سے پڑھ لیا جائے تو قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کو سمجھنے کی راہیں آسان ہو جاتی ہیں۔ (صفحہ ۱۲)

مصر کا سیفٹی ایکٹ

اپنی تفسیر کے صفحہ ۲۹۹ پر مودودی صاحب جس طرز پر حضرت یوسف علیہ السلام کی قید کا ذکر کرتے ہیں (انڈکس میں اس کے لئے عنوان "مصر کا سیفٹی ایکٹ" تجویز کرتے ہیں) اور اس کے تحت لکھتے ہیں:-

> اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی شخص کو شرائطِ انصاف کے مطابق عدالت میں مجرم ثابت کئے بغیر بس یونہی پکڑ کر جیل بھیج دینا، بے ایمان حکمرانوں کی پرانی سنت ہے۔ اس معاملہ میں بھی آج کے شیاطین چار ہزار برس پہلے کے اشرار سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ فرق اگر ہے تو بس یہ کہ وہ جمہوریت کا نام نہیں لیتے اور یہ اپنے ان کرتوتوں کے ساتھ یہ نام بھی لیتے ہیں۔ وہ قانون کے بغیر اپنی غیر قانونی حرکتیں کیا کرتے تھے۔ اور یہ ہر ناروا زیادتی کے لئے پہلے ایک "قانون" بنا

> لیتے ہیں۔ وہ صاف صاف اپنی اغراض کے لئے لوگوں پر دست درازی کرتے تھے۔ اور پھر پر ڈھٹائی سے ڈالتے ہیں اس کے متعلق دنیا کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس سے ان کو نہیں بلکہ ملک اور قوم کو خطرہ تھا۔ غرض وہ ظالم تھے۔ پر اس کے ساتھ جھوٹے اور بے حیا بھی ہیں۔ (صفحہ ۳۹۰، جلد ۲)

قرآن مجید کے الفاظ کے مطابق عزیزِ مصر کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام سے ناجائز مطالبہ کیا اور ساتھ ہی دھمکی بھی دی کہ اگر اس کی خواہش پوری نہ کی گئی تو وہ اسے جیل بھجوا دیگی۔ حضرت یوسف نے اس برائی کے بجائے خوشی خوشی جیل جانا منظور فرما لیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مودودی صاحب اسے اپنے سیفٹی ایکٹ پر کیسے اور کیوں منطبق فرما رہے ہیں۔ اس کی حقیقت اس وقت کھلتی ہے جب آپ کی تفسیر کی جلد اول کے مقدمے پر نظر ڈالی جائے جس میں آپ فرماتے ہیں کہ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں یکایک مجھے پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت جیل بھیج دیا گیا۔

اپنی قید کو انبیاء کی آزمائش کے ہم پلّہ قرار دینا

چنانچہ مذکورہ بالا تفسیر کے ذریعے اپنی قید کو حضرت یوسف علیہ السلام کی آزمائش کے ہم پلّہ قرار دینے کے لئے آپ انہیں بھی مصر کے سیفٹی ایکٹ کے تحت جیل بھجواتے ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مودودی صاحب کو بھی کسی اونچے خاندان کی عورت نے اپنی خواہشات کا کھلونا بنانا چاہا تھا کہ جس کے انکار پر انہیں جیل بھجوا دیا گیا تھا؟ اگر یہ بات نہیں تھی تو انہیں اپنے آپ کو ایک اولوالعزم نبی کے ہم پایہ قرار دینے کے لئے کچھ تو تامل کرنا چاہیے تھا۔ آخر خود ستائی اور انانیت کی کوئی حد ہونی چاہیے۔ مودودی صاحب کو جس سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کیا گیا تھا وہ بانیٔ پاکستان قائداعظمؒ کے زمانۂ حیات میں بنایا گیا تھا اور جس پر قائدِ ملت لیاقت علیخان کے زمانے میں عمل ہوتا رہا اور انہی کے زمانے میں انہیں گرفتار کیا گیا۔ خود مودودی صاحب کو بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کا جرم کیا ہے اور عامۃ الناس کو بھی۔ یہ تھا مسئلہ کشمیر کے متعلق ان کا وہ فتویٰ جس نے عین اس وقت جب ملک کو اس باب میں متفق الرائے ہونے کی اشد ضرورت تھی (اور ملک متفق الرائے تھا) بحث و نزاع کا دروازہ کھول دیا اور جو لوگ کشمیر کی آزادی کے لئے ہر طرح کی قربانی کے لئے سربکف کھڑے تھے ان کے دلوں کو تذبذب کی آماجگاہ بنا دیا۔ اس سے ملک کی سلامتی کو جو نقصان پہنچا

مودودی صاحب کو قید کرنیوالے حکمران بے ایمان، شیطان، ظالم، جھوٹے اور بے حیا ہیں

اس کے احساس سے خود جماعتِ اسلامی کو ایک حد تک اپنے امیر کے فتوے سے لاتعلقی کا اظہار کرنا پڑا (ترجمان القرآن۔ بابت ستمبر ۴۸ء صفحہ ۳۲۸) ایک نوزائیدہ مملکت میں اتنی بڑی کھلبلی پیدا کرنے کے باوجود اپنی قید کو تقدس کا جامہ پہنانے کے لئے پہلے اس کا ذکر اپنی تفسیر کے مقدمے میں کرتے ہیں اور پھر جن پاکستانی حکمرانوں نے سیفٹی ایکٹ کے تحت انہیں قید کیا، انہیں اور اس قانون کے بنانے والے پاکستانی حکمرانوں کو تفسیر جیسی سنجیدہ کتاب میں "بے ایمان، شیطان، ظالم، جھوٹے اور بے حیا" جیسی مغلظات سے نوازتے ہیں۔ قارئین نے یہ چیز بڑے دکھ کے ساتھ محسوس کی ہوگی کہ ان کی ان دشنام طرازیوں کی زد کس طرح قائداعظم اور قائدِ ملت پر پڑ رہی ہے!

(۷)

پتھر کے بت اور اولیاء اور انبیاء کو مدد کیلئے پکارنا

صاحب تفسیر اپنی تفسیر کے صفحہ ۵۳۳ کے مضمون کے لئے جو سرخی اڈکس ہیں دیتے ہیں اس کے الفاظ ہیں " صرف پتھر کے بت پوجنا ہی شرک نہیں بلکہ اولیاء اور انبیاء کو مدد کے لئے پکارنا بھی شرک ہے " اور اس کے تحت فرماتے ہیں :-

> یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ یہاں خاص طور پر جن بناوٹی معبودوں کی تردید کی جا رہی ہے وہ فرشتے یا جن یا شیاطین یا لکڑی پتھر کی مورتیاں نہیں ہیں۔ بلکہ اصحاب قبور ہیں۔ اسلئے کہ فرشتے اور شیاطین تو زندہ ہیں۔ ان پر اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاءٍ کے الفاظ کا اطلاق نہیں ہو سکتا اور لکڑی پتھر کی مورتیوں کے معاملہ میں بعث بعد الموت کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اسلئے مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ کے الفاظ انہیں بھی خارج از بحث کر دیتے ہیں۔ اب لامحالہ اس آیت میں اَلَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سے مراد وہ انبیاء اولیاء، شہداء، صالحین اور دوسرے غیر معمولی انسان ہی ہیں جن کو غالی معتقدین ' داتا مشکل کشا، فریاد رس، غریب نواز، گنج بخش اور نہ معلوم کیا کیا قرار دے کر اپنی حاجت روائی کے لئے پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ (صفحہ ۵۳۳)

غالی معتقدین کی ناپسندیدگی کی تلافی

دین کا صحیح علم نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے ہاں قبر پرستی اور اولیاء اللہ کو مدد کے لئے پکارنا ایک عام رواج سا بن گیا ہے۔ اس لئے اس رواج کو ختم کرنے کے لئے جہاں سے بھی کوئی آواز اٹھتی ہے ہم اس کی تعریف و تائید کرتے ہیں۔ مودودی صاحب کے مجموعہ تضادات میں ایسی عبارت کا سامنے آنا ہمارے لئے باعث خوشی ہوا۔ چونکہ ہمارے ملک میں اس قسم کے " غالی معتقدین " کی بڑی کثرت ہے۔ اور ایک انتخاب لڑنے والی پارٹی اسے کبھی برداشت نہیں کر سکتی کہ وہ اتنی بڑی اکثریت کو ناراض کر لے، اس لئے مودودی صاحب ان کی ناپسندیدگی دور کرنے کے لئے موقع کی تلاش میں رہے اور یہ موقع انہیں جلد ہی مل گیا۔ ہوا یوں کہ صدر ناصر سے ناراضگی کے بعد سعودی عرب کے بادشاہ نے مختلف اسلامی ممالک میں غلاف کعبہ تیار کروائے۔ پاکستان میں یہ کام جماعت اسلامی نے سرانجام دیا۔ ان کا تیار کروایا ہوا غلاف کعبہ شریف کی زینت تو نہ بن سکا لیکن انہوں نے عوام کے مذہبی جذبات سے اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لئے ملک بھر میں اس غلاف کے کپڑے کے جلوس نکالے اور لاہور میں ایک ایسے ہی جلوس کے دوران اسے داتا دربار کا بھی طواف کرا دیا۔ اور اس طرح مودودی صاحب نے " غالی معتقدین " کے دل سے یہ اثر زائل کر دیا کہ وہ قبر پرستی کے خلاف ہیں۔ سیکیا ولی سیاست انسان سے کیا کچھ نہیں کراتی -!

معراج نبوی جسمانی تھا یا روحانی

صحابہ کرام اور سلف صالحین کے درمیان معراج نبویؐ کی نوعیت کے بارے میں (کہ یہ جسمانی تھا یا روحانی) شروع ہی سے اختلاف رہا ہے۔ چنانچہ تمام مفسرین نے اس اختلاف کی طرف اشارہ کیا ہے؛ بلکہ وہ اس حد تک

تصریح کرتے ہیں کہ اگرچہ اکثر صحابہؓ اور تابعین ؒ اس طرف گئے ہیں کہ معراج روح و جسم دونوں پر طاری ہوا لیکن حضرت عائشہؓ، حضرت حذیفہ بن الیمانؓ، حضرت حسنؓ، حضرت امیر معاویہؓ اور ابن اسحاق وغیرہم (رض) سے مروی ہے کہ یہ ایک روحانی معاملہ تھا۔ دیانت کا تقاضا تھا کہ مودودی صاحب اِن دونوں گروہوں کے اقوال نقل کرتے کے بعد اپنی رائے دیتے لیکن وہ صحابہ کرامؓ کے اس اختلاف کی طرف کسی قسم کا اشارہ کئے بغیر فرماتے ہیں کہ ہمارے لئے یہ ماننے بغیر چارہ نہیں کہ یہ محض ایک روحانی تجربہ نہ تھا۔ بلکہ ایک جسمانی سفر اور عینی مشاہدہ تھا جو اللہ تعالےٰ نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو کرایا۔ (صفحہ ۵۰۹)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مودودی صاحب اپنی فہم قرآن کو ان صحابہؓ کے فہم قرآن سے اعلیٰ سمجھتے ہیں کہ جو معراج کے روحانی ہونے کے قائل تھے؛ اسی لئے وہ ان کے عقیدہ کو اس قابل ہی نہیں سمجھتے کہ اس کی طرف اشارہ تک بھی کیا جائے۔

~~~~~~~~~~(۰)~~~~~~~~~~

ایک کپکپا دینے والا مقام

اب ہم اس تفسیر کے اُس گوشے کی طرف آتے ہیں جسے دیکھ کر ہمارا سر چکرا گیا اور جس کے نتائج کے احساس سے ہماری روح پر کپکپی چھا گئی۔

اس گوشے تک پہنچنے سے پہلے ایک تمہیدی وضاحت ضروری ہے۔

مودودی صاحب مطالبۂ پاکستان کی مخالفت میں اس حد تک متشدد تھے کہ انہوں نے برملا کہہ دیا کہ اس جدوجہد کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ مسلمانوں کی 'کافرانہ ریاست' ہوگی بلکہ اس سے بھی بدتر۔ اُن کی اس مخالفت کے علی الرغم پاکستان وجود میں آگیا تو وہ نہایت بے جگری سے ہندوستان سے بھاگ کر اسی کافرانہ ریاست میں پناہ لینے کے لئے آگئے ـــ کچھ ایسا نظر آتا ہے جیسے وہ اس مملکت کو تباہ کرنے کے لئے مامور کئے گئے تھے، ورنہ اُن کا ان حالات میں پاکستان کی طرف رُخ کرنا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہاں آنے کے بعد انہوں نے سب سے پہلے حکومت کے ملازمین کے دل میں حکومت کے خلاف بغاوت کے جراثیم بیدار کئے۔ جب پنجاب گورنمنٹ نے اپنے ملازمین سے مملکت کی وفاداری کا حلف لینے کو کہا تو اس جماعت سے متاثرین نے اس سے انکار کر دیا۔ پھر انہوں نے یہ بھی فتوےٰ دیا کہ فوج کی ملازمت بھی ناجائز ہے۔ اس مقام پر بعض لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ حضرت یوسفؑ جیسے اولوالعزم رسول نے فرعون جیسے کافر کی حکومت میں منصب قبول کر لیا تھا۔ یہاں کی حکومت نہ تو فرعون سے زیادہ کافر ہے اور نہ ہم لوگ حضرت یوسفؑ سے زیادہ بلند مرتبت تو پھر اس حکومت کی ملازمت کس طرح ناجائز قرار دی جا سکتی ہے۔ اعتراض بڑا وزنی تھا لیکن مودودی صاحب تو ان میں سے ہیں جنہوں نے کبھی اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے دعویٰ کے جواز میں ثبوت اور دلائل پیش کرنے کے لئے دامنِ حضرت یوسفؑ کے چاک کرنے میں کوئی باک محسوس نہ کیا۔ یہ ہے اس تفسیر کا وہ مقام جس سے ہماری روح پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے تو یہ کہا کہ یہ دعویٰ ہی غلط ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرعون کی حکومت میں کوئی منصب قبول کر لیا تھا۔ تفسیر کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مقام کی تفسیر میں دورِ انحطاط کے مسلمانوں نے کچھ اس ذہنیت
~~~~~~~~~~

کا اظہار کیا ہے جو کبھی یہودیوں کی خصوصیت تھی۔ یہ یہودیوں کا حال تھا کہ جب وہ ذہنی و اخلاقی پستی میں مبتلا ہوئے تو پچھلی تاریخ میں جن جن بزرگوں کی سیرتیں اُن کو بلندی پر چڑھنے کا سبق دیتی تھیں اُن سب کو وہ نیچے گرا کر اپنے مرتبے پر اتار لاتے تاکہ اپنے لئے اور زیادہ نیچے گرنے کا بہانہ پیدا کریں۔ افسوس یہی کچھ مسلمانوں نے کیا۔ انہیں کافر حکومتوں کی چاکری کرنی تھی۔ مگر اس پستی میں گرتے ہوئے اسلام اور اس کے علمبرداروں کی بلندی دیکھ کر انہیں شرم آتی۔ لہٰذا اس شرم کو مٹانے اور اپنے ضمیر کو راضی کرنے کے لئے یہ اپنے ساتھ اس جلیل القدر پیغمبر کو بھی خدمتِ کفر کی گہرائی میں لے گرے جس کی زندگی دراصل انہیں یہ سبق دے رہی تھی کہ اگر کسی ملک میں ایک اور صرف ایک مردِ مومن بھی خالص اسلامی اخلاق اور ایمانی فراست و حکمت کا حامل ہو تو وہ تن تنہا تنہا اپنے اخلاق اور اپنی حکمت کے زور سے اسلامی انقلاب برپا کر سکتا ہے۔ (صفحہ ۱۳۱)

آگے بڑھنے سے پہلے ذرا یہ دیکھتے جائیے کہ جسے یہ مفسر خدمتِ کفر قرار دے رہا ہے، خود خدا اس کے متعلق کیا کہتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت یوسفؑ نے خود فرعونِ مصر سے یہ کہا تھا کہ مملکت کے مالیات یا اراضیات کے نظم و نسق کا شعبہ میرے سپرد کر دیا جائے۔ میں اس کا ایسا انتظام کر سکتا ہوں جس سے قحط کی یہ انسانیت سوز مصیبت ٹل جائے گی (۱۲/۵۵)۔ اللہ تعالیٰ نے اس منصب کو اپنی "رحمت" قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ہم محسنین کا اجر ضائع نہیں کیا کرتے (۱۲/۵۶)۔ یہ ہے خدا کی نگاہوں میں اس منصب کی پوزیشن۔ جسے مودودی صاحب خدمتِ کفر قرار دیتے ہیں۔

لیکن مودودی صاحب کا مقصد تو اس سے بھی حاصل نہ ہوا۔ یہ خدمت کفر تھی یا رحمتِ خداوندی بہرحال ایک کافر بادشاہ کی حکومت میں ملازمت تو ضرور تھی۔ اس خود ساختہ پھندے سے نکلنے کے لئے مودودی صاحب نے فرمایا کہ حضرت یوسفؑ ہرچند شاہِ مصر کے ہاں بہت بڑے منصب پر فائز تھے لیکن وہ "مصر کے شاہی قانون پر عمل نہیں کرتے تھے۔" (صفحہ ۴۰۰)

یعنی انہوں نے اس حکومت کا منصب تو ضرور قبول کر رکھا تھا لیکن عمل اس حکومت کے قوانین کے خلاف کرتے تھے۔ آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب کس طرح اپنی سیرت و کردار کو پیراہنِ یوسفی پہنا رہے ہیں!

اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ حضرت یوسفؑ حکومتِ فرعون کے قوانین کی خلاف ورزی کیا کرتے تھے۔ اس کے ثبوت کے لئے تیرا ایک وضاحتی پس منظر کی ضرورت پیش آئی جب حضرت یوسفؑ کے بھائی (دوسرے بھائیوں کے ساتھ) مصر میں آتے ہیں تو حضرت یوسفؑ کا جی چاہتا تھا کہ انہیں اپنے پاس رکھ لیں لیکن مصر کا قانون یہ تھا کہ کسی غیر ملکی کو کسی جرم کے بغیر روکا نہیں جا سکتا۔ (۱۲/۷۶)۔ اس مشکل کے حل کے لئے ۔۔۔

لے واضح رہے کہ اس جرم کے مجرم اِس زمانے کے مسلمان ہی نہیں، ائمہ متقدمین نے بھی اپنی تفاسیر میں یہی لکھا کہ حضرت یوسفؑ نے حکومتِ فرعون میں منصب قبول کر لیا تھا۔ (طلوعِ اسلام)

مودودی صاحب کے الفاظ میں حضرت یوسفؑ نے ایک اسکیم تیار کی کہ کس طرح اپنے بھائی کو مجرم ٹھہرا کر اسے روک لیا جائے۔ اس سلسلے میں وہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں :-

> دونوں بھائیوں میں مشورہ ہوا ہوگا (یعنی بن یامین کو چور بنانے کا) کہ اسے روکنے کی تدبیر کی جائے، اگرچہ تھوڑی دیر کے لئے اس میں بھائی کی سبکی تھی کہ اس پر چوری کا دھبہ لگتا تھا لیکن بعد میں یہ دھبہ اس طرح آسانی سے دھل سکتا تھا کہ دونوں بھائی اصل معاملہ کو دنیا پر ظاہر کر دیں۔ (صفحہ ۱۹۸)

چنانچہ اس اسکیم کے مطابق (مودودی صاحب کی تفسیر کی رو سے) حضرت یوسفؑ نے بن یامین کے سامان میں اپنا شاہی کٹورہ رکھ دیا، پھر اسے پکڑوا دیا اور اس طرح چوری کے جرم میں اپنے بھائی کو اپنے پاس روک لیا۔ ملاحظہ فرما رہے ہیں آپ خدا کے ایک اولوالعزم پیغمبر کی سیرت کا نمونہ مودودی صاحب کے آئینہ میں۔ (استغفر اللہ! استغفر اللہ!)

(ضمناً) ان سے کون پوچھے کہ اگر حضرت یوسفؑ مملکت کے قانون کی خلاف ورزی کیا کرتے تھے تو وہ کس کا قانون تھا جس کی رو سے انہوں نے چوری کے جرم میں بن یامین کو روک لیا تھا۔؟

بہرحال، یہ ہے نمونہ اس تفسیر کا جسے ہزار سالہ اسلامی لٹریچر میں فقید المثال قرار دیا جا رہا ہے اور جس کے مصنف کو امام احمد بن حنبلؒ اور امام ابن تیمیہؒ کا ہمسر بتایا جاتا ہے۔ اس تفسیر کی تکمیل پر تقاریب جشن منانے والوں سے تو ہمیں کوئی گلہ نہیں کیونکہ وہ تو مودودی صاحب کے تنخواہ دار ملازم یا خوشامدی مصاحب ہیں۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں ان "دانشوران قوم" سے جنہوں نے ان تقاریب میں اس تفسیر کی مدح و ستائش میں اس قدر بلند آہنگ قصیدہ خوانی کی ہے کہ کیا انہوں نے اس تفسیر کو پڑھ کر ایسا کچھ کہا ہے۔ اگر انہوں نے اسے پڑھنے کے بعد ایسا کہا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان تفصیلی نکات میں مودودی صاحب کے ہمنوا ہیں اور اسے حسن کی خدمت جلیلہ تصور کرتے ہیں تو ہم ان کے متعلق بھی کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ مصنف کے ساتھ ان کا محاسبہ بھی ان کے خدا کے ہاں ہوگا اور اگر انہوں نے اس تفسیر کو پڑھا ہی نہیں یا پڑھنے کے بعد محض چند مزعومہ مصالح کے پیش نظر مداہنت برتی ہے تو کیا انہوں نے سوچا بھی ہے کہ اس سے انہوں نے جس قدر عوام کو گمراہ کیا ہے اس کا ان کے پاس کیا جواب ہے۔ خدا، اس کے برگزیدہ انبیاء، اور اس کی کتاب عظیم کے ساتھ اس قسم کی بیباکانہ گستاخی کون سی عدالت میں قابل عفو قرار پائے گی۔!!

---(٠)---

اس تفسیر کی تیسری جلد پر تبصرہ کے لئے انتظار فرمایئے۔

شکریہ

میری اہلیہ کے اچانک انتقال کی خبر پا کر اکثر احباب نے مجھے تعزیتی پیغامات بھیجے ہیں میں ان کی طرف سے اظہار ہمدردی کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔

(مرزا) محمد خلیل - ناظم ادارہ

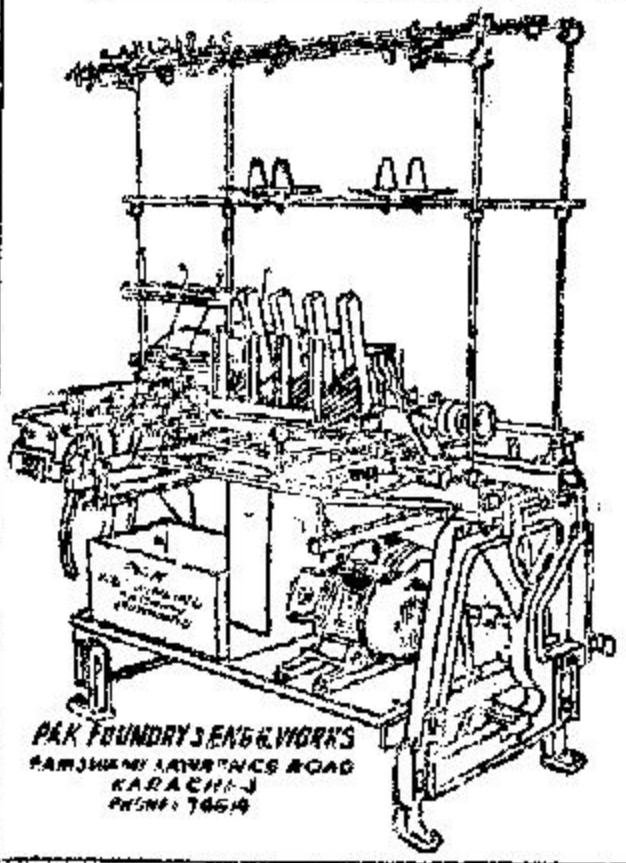

SOLE MANUFACTURERS

of

FOUR SPINDLE
AUTOMATIC
PIRN WINDING
MACHINES

PAK FOUNDRY & ENGG. WORKS

RAMSWAMI

LAWRENCE ROAD,

KARACHI.3 PHONE; 74614

کپڑے دھونے کیلئے بہترین صابن

(رجسٹرڈ ٹریڈ مارک)

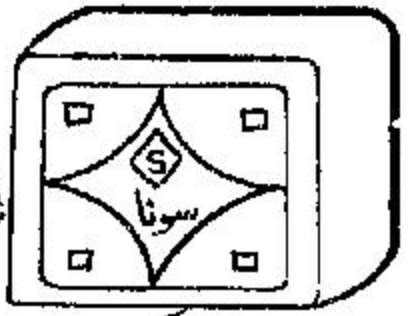

ہمیشہ
استعمال
کیجئے

(رجسٹرڈ ٹریڈ مارک)

برش چھاپ ـــــ اور ـــــ سونا مارکہ

سوتی، اونی اور ریشمی کپڑوں کو صاف وشفاف کرتا ہے ←←←← ـــــ ← ہر جگہ دستیاب ہے

ثریا سوپ فیکٹری کراچی

SURYA SOAP FACTORY KARACHI